اشتیاق احم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

خونی دعوت

اشتیاق احمد

اٹلانٹس پبلکیشنز

تفریح بھی، تربیت بھی

اٹلانٹس پبلیکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول — خونی دعوت

نمبر — انسپکٹر جمشید سیریز نمبر 155

پبلشر — فاروق احمد

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

D-83 سائٹ۔ کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk

ایک حدیث

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ تمہاری شکل و صورت اور مال کو نہ دیکھے گا،

بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو

دیکھے گا۔"

☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

☆ یہ وقت عبادت کا تو نہیں۔

☆ آپ کو اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔

☆ آپ نے کسی کو وقت تو دے نہیں رکھا۔

☆ آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے عبادت اور دوسرے کاموں سے فارغ ہولیں، پھر ناول پڑھیں۔

اشتیاق احمد

دو باتیں

السلام علیکم!

خونی دعوت انسپکٹر جمشید کا سوواں ناول ہے۔ کچھ لوگوں کی فرمائش تھی کہ سوواں ناول خاص نمبر ہونا چاہیے، لیکن اگر پچیسواں، پچاسواں اور پچھترواں ناول خاص نمبر نہیں تھے تو یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اپنا تو ایک الگ طریقہ کار ہے۔ ہر چھ ماہ بعد دونوں ٹیموں کا ایک خاص نمبر اور شوکی سیریز کا بھی الگ خاص نمبر شروع کر دیا گیا ہے۔ ہر چھ ماہ بعد خاص نمبر کا جو نمبر بھی آجائے، آخر سوواں نمبر ہی کیوں خاص نمبر ہو، ایک سو ایک واں کیوں نہیں ہوسکتا، یہ کیا بات ہوئی، ہیں جی۔

اس ماہ کے ناولوں میں خاص نمبروں اور آستین کا سانپ کے انعامات کا اعلان کیا جا رہا ہے، جن لوگوں نے انعامات حاصل کیے، انہیں میری طرف سے مبارک ہو اور جو انعامات حاصل کرنے سے رہ گئے، ان کی خدمت میں عرض ہے کہ بُرا سا منہ بنانے، مسمی صورت بنانے اور مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، کیونکہ مایوسی گناہ ہے۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں، ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر خاص نمبر شائع ہوں گے۔ آپ کو پھر مواقع ملیں گے اور آپ پھر ناکام ہوں گے، لہٰذا سارا بسورنا اسی موقعے پر ختم نہ کر دیں۔ اب آپ کہیں گے، اس بار کی دو باتیں خشک رہیں۔ چلیے ان کی خشکی کو دور کرنے کے لیے خود بخود ہی مسکرا دیجیے، ج ہاں اور کیا۔

اشتیاق احمد

نرم ناراض

ان دنوں انہیں موسمِ بہار کی چھٹیاں تھیں۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کے ایک دیرینہ دوست کا خط انہیں ملا۔ خط میں لکھا تھا:

"ڈیر جمشید،

یہ چھٹیاں کالمبا وادی میں گزارو، بہت لطف رہے گا۔ میں قدم قدم پر تمہارا ساتھ دوں گا۔ ان دنوں اس وادی کا حسن دیکھنے کی چیز ہے۔ قدرت نے یہاں ایسے نظارے بکھیرے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مجھے امید ہے، تم میری دعوت کو ٹھکراؤ گے نہیں۔ ایک خط بچوں کے نام الگ لکھ رہا ہوں، تا کہ تم ان سے میری دعوت پوشیدہ نہ رکھ سکو۔ میں بہت بے چینی سے انتظار کروں گا۔

فقط تمہارا پرانا دوست

ارشد لطیفی"

تقریباً اسی طرح کے الفاظ پر مشتمل ایک خط ان تینوں کے نام موصول ہوا۔ ابھی وہ خط پڑھ رہے تھے کہ انسپکٹر جمشید دفتر سے لوٹ آئے۔ انہیں خط دفتر کے پتے پر ملا تھا۔

"تو تم تک بھی خط پہنچ گیا۔" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولے۔

"جی ہاں، لیکن اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے اباجان، اگر آپ کا لمباوادی جانا پسند نہیں کرتے تو رہنے دیں، ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔" محمود نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بات نہیں۔ اپنا خط مجھے دکھاؤ۔" وہ بولے۔

محمود نے خط ان کی طرف بڑھا دیا، ادھر انہوں نے اپنا خط انہیں دے دیا، وہ ان کا خط پڑھنے لگے۔

"چھٹیاں تو صرف ہمیں ہیں، آپ کو تو نہیں۔ آپ کے دوست نے یہ کیسے لکھ دیا کہ آپ کو چھٹیاں ہیں۔"

"اس کا مطلب تمہاری چھٹیوں سے ہوگا۔ ظاہر ہے، تمہیں چھٹیاں نہیں ہوں گی تو سیر کا پروگرام کس طرح بن سکتا ہے۔"

"پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"دو کے بجائے اگر ایک خط ملا ہوتا تو میں ہرگز نہ جاتا، کیونکہ ان دنوں یہاں بہت مصروفیت ہے۔" انہوں نے کہا۔

"جی کیا مطلب؟ آپ اس صورت میں یہ خط ہمیں نہ دکھاتے۔"

"یہ بات نہیں۔ اگر تمہیں بھی خط مل گیا ہے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں چاہوں تو اب بھی وہاں نہ جاؤں۔" وہ بولے۔

"تو پھر آپ جانے پر کیوں رضامند ہو گئے ہیں؟"

"اس دوسرے خط کی وجہ سے۔ آخر ارشد لطیفی کو دوسرا خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ میری عادات سے واقف ہے۔ جانتا ہے، تم تینوں مل کر بھی مجھے کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں تو اسے صرف مجھی کو خط لکھنا چاہیے تھا۔"

"آپ۔ آپ کہیں اس معاملے میں جاسوسی پہلو تو نہیں نکال رہے۔"

"ہاں، اس دوسرے خط نے معاملے کو خالص جاسوسی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں جانا ہی ہوگا۔"

"تو پھر بسم اللہ کیجیے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی، فرزانہ چلا اٹھی:

"انکل خان رحمان آ گئے۔" محمود اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔

انسپکٹر جمشید کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"حیرت ہے، بھلا خان رحمان کی آمد پر پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔" بیگم جمشید بول پڑیں۔

"یہ جاسوسی معاملے ہیں بیگم، تم نہیں سمجھو گی۔"

"جی، کیا مطلب؟ کیا بھائی خان رحمان کی آمد بھی جاسوسی معاملہ ہے؟" وہ حیران رہ گئیں۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ عین اس وقت آئے ہیں، جب ہم خط پڑھ کر فارغ ہی ہوئے ہیں۔" اتنے میں خان رحمان کی چہکتی آواز سنائی دی:

"بھئی جمشید، میں تم سے سخت ناراض ہوں۔"

"تو انکل، آپ نرم ناراض بھی ہوتے ہیں؟" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں بالکل۔ ہائیں، کیا کہا تھا تم نے۔ نرم ناراض، یہ کیا ہوتا ہے۔"

"لیجیے، انکل آتے ہی اس کی باتوں میں الجھ گئے۔ مہربانی فرما کر ناراضی کی وجہ بتائیے، تاکہ ہماری جان میں جان آ سکے۔"

"میں نے سنا ہے، تم لوگ کا لمباوادی جا رہے ہو اور مجھے پوچھا تک نہیں،"

جب کہ بچوں کو ان دنوں چھٹیاں تھیں اور میں پہلے ہی کہیں سیر کے لیے جانے کا پروگرام بنانے والا تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں خان رحمان۔" انسپکٹر جمشید سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"کیسی کوئی بات نہیں؟" وہ بولے۔

"میرے دوست ارشد لطیفی کا خط مجھے تھوڑی دیر پہلے دفتر میں ملا ہے۔ ادھر ان تینوں کو ایک خط ابھی ابھی گھر کے پتے پر ملا ہے۔ ہم تو ابھی دونوں خط پڑھ کر فارغ ہی ہوئے ہیں اور جانے کا فیصلہ کر ہی پائے تھے کہ تم آ پہنچے، ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سفر کے لیے میں تمہیں اور پروفیسر کو دعوت دینے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا۔"

"یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" خان رحمان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا ... ہم کالمباوادی جا رہے ہیں۔"

"ارشد لطیفی کا ایک خط مجھے بھی ملا ہے۔"

"اوہو، اچھا۔ ذرا دکھانا تو۔" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا اور خان رحمان نے خط نکال کر انہیں دے دیا۔ چاروں اس پر جھک گئے۔ لکھا تھا:

"ڈیر خان رحمان،

میں ارشد لطیفی ہوں۔ آپ کے دوست، انسپکٹر جمشید کا دوست۔ میں نے انہیں کالمباوادی آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ تیاری کر رہے ہوں گے۔ آپ کی پر بہار شخصیت کا ذکر کئی دوستوں سے سُن چکا ہوں، اگر آپ بھی ان کے ساتھ آ جائیں، تو لطف اور ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے، آپ مایوس نہیں کریں گے۔

ارشد لطیفی"

خط پڑھ کر ان کی حیرت اور انسپکٹر جمشید کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا، پھر انسپکٹر جمشید نے منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر پروفیسر داؤد کے نمبر ڈائل کیے:

"ہیلو پروفیسر صاحب، جمشید بول رہا ہوں۔"

"اچھا ہی ہوا جمشید، تم نے فون کر لیا۔ میں تو تمہاری طرف آنے ہی والا تھا۔"

"تو آپ کو بھی ارشد لطیفی کا خط مل چکا ہے؟"

"ہاں جمشید، میں آ رہا ہوں۔" وہ چہک کر بولے۔

"بہتر، تشریف لے آئیے۔" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"پروفیسر صاحب کو بھی ارشد لطیفی کا خط مل چکا ہے اور اب میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے خلاف کوئی گہری سازش کی جا رہی ہے، اس سازش کی ابتدا ہو چکی ہے۔"

"سازش اور وہ بھی گہری۔ جمشید، یہ تم کیا کہہ رہے ہو، بھلا خطوط کے معاملے میں سازش کا کیا امکان؟" خان رحمان بولے۔

"ارشد لطیفی بہت ہی کنجوس آدمی ہے۔ اپنے گھر میں کسی ایک مہمان کو برداشت کرنا بھی اس کے بس کی بات نہیں۔ میں جب بھی کبھی کالمباوادی گیا، اس کے ہاں کبھی نہیں ٹھہرا۔ ہاں اس سے ملنے ضرور گیا اور اس نے کبھی پھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا، بھئی کہاں ٹھہرے ہو۔ سیدھے میرے ہاں کیوں نہیں آئے، پھر اب یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہم سب کو دعوت دے رہا ہو۔ چلو مجھے اور ان تینوں کو تو بلا لیا، ساتھ میں تم لوگوں کو بھی دعوت دی جا رہی ہے، لہٰذا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دعوت، خونی دعوت ..... موت کی دعوت ہے۔ خان رحمان تم اور پروفیسر صاحب ہمارے ساتھ

جانے کی کوشش نہ کریں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو تم کیوں جا رہے ہو۔ تم بھی جانے کا ارادہ ترک کر دو۔"

"مجھے تو یہ دیکھنے کے لیے جانا ہی ہوگا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔" وہ بولے۔

"تب پھر ہم بھی یہی دیکھنے کے لیے جائیں گے۔"

"بھئی، بلاوجہ خطرے میں نہ کودو۔" وہ بُرا سا مان کر بولے۔

"تمہارے ساتھ خطرہ، خطرہ نہیں لگتا، شاندار مہم لگنے لگتا ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"مجھے یہی ڈر تھا کہ تم نہیں مانو گے۔"

"ڈر تھا تو پھر کیوں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔" خان رحمان بولے۔

"ابا جان، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہاں ہمارے لیے سرے سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ یہ صرف آپ کا خیال ہو۔"

"ناممکن، ارشد لطیفی اتنی فراخدلانہ دعوت کبھی نہیں دے سکتا۔" انہوں نے کہا۔

"اب تو وہاں جلد از جلد پہنچنے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔ کیا ہم تیاری کریں؟"

"ہاں، صبح فجر کے بعد ایک جہاز جاتا ہے۔ میں اس پر سیٹیں بک کرائے لیتا ہوں۔"

"ہم سب بھی، یعنی بچوں سمیت ساتھ چل رہے ہیں۔" خان رحمان نے گویا یاد دہانی کرائی۔

"ہاں خان رحمان، مجھے معلوم ہے، تم جیسا ضدی دوست کیا کسی کو ملا ہوگا۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"شکریہ۔" وہ خوش ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید فون کرنے لگے۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ پروفیسر داؤد بھی پہنچ گئے۔ انہیں ملنے والے خط کے الفاظ بھی خان رحمان والے خط جیسے ہی تھے۔ انہیں جب خان رحمان نے یہ بتایا کہ اس معاملے میں جاسوسی ٹانگ اڑی ہوئی ہے تو وہ خوش ہو کر بولے:

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، تمہارے ساتھ اب جاسوسی مہمات کا لطف بالکل ایسے آنے لگا ہے، جیسے کوئی کامیاب ایجاد کر کے آتا ہے۔"

"اور مجھے ایسا لطف آتا ہے، جیسے میں کسی فوجی مشن پر نکلا ہوں۔" خان رحمان مسکرائے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ارشد لطیفی نے ہی نہیں، آپ دونوں نے بھی میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے۔"

"ہائیں ہائیں جمشید، سازش اور ہم۔" پروفیسر داؤد بوکھلا کر بولے۔

"اچھا خیر، صبح کے جہاز پر سیٹیں بک ہو گئی ہیں۔ آپ لوگ جا کر بچوں کو لے آئیے، رات یہیں گزاریے، تاکہ ہم وقت پر ائیر پورٹ پہنچ سکیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس سے معقول تجویز تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔" خان رحمان پرجوش لہجے میں بولے۔

☆☆

دوسری صبح جب سورج اپنی کرنیں کالمبا وادی کی پہاڑیوں پر بکھیر چکا تھا، وہ جہاز سے اتر کر ٹیکسیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے ارشد لطیفی کے محل نما مکان کا پتا ڈرائیوروں کو بتا دیا۔ وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ انسپکٹر جمشید نے نیچے اتر کر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور بیگم لطیفی کا چہرہ دکھائی دیا۔ ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی:

"بھائی جان، آپ......یعنی کہ....."

"صرف میں ہی نہیں، میرے ساتھ میرے بچے اور دوست بھی ہیں۔"

انہوں نے دل ہی دل میں مسکرا کر کہا، کیونکہ بیگم لطیفی کنجوسی میں اپنے خاوند سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔

"آ۔آ۔آئیے، تشریف لے آئیے۔" اس نے بمشکل کہا۔

"لطیفی کہاں ہے؟"

"اندر ہی ہیں۔ شیو کر رہے ہیں۔ اسی لیے دروازہ کھولنے نہیں آ سکے۔"

وہ اندر داخل ہوئے۔ صحن میں ہی ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی آئینے کے سامنے کھڑا شیو کرتا نظر آیا۔

"ہیلو لطیفی۔" انسپکٹر جمشید چہک کر بولے۔

"بائیں جمشید۔ یہ تم ہو۔ بھئی، بغیر اطلاع ہی آ گئے۔ آنے سے پہلے فون ہی کر دیا ہوتا۔ خط ہی لکھ دیا ہوتا۔" یہ کہتے وقت اس کی نظر پیچھے آنے والوں پر پڑی اور پھر اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

"خیر تو ہے بھئی، تم کچھ چپ چپ ہو گئے۔ ویسے اگر تم نہ بلاتے تو ہم سیدھے کسی ہوٹل کا رخ کرتے۔ تمہارے خطوط نے مجبور کر دیا۔" انہوں نے فوراً

مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"میرے خط، یہ کیا کہہ رہے ہو بھئی، میں نے تو تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔"

"اچھا، کمال ہے، دیکھو تو ذرا۔" انسپکٹر جمشید نے چاروں خط نکال کر اسے دے دیے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں پڑھتا گیا۔ پھر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں خوف دوڑ گیا۔ اس کے منہ سے کپکپاتی آواز میں نکل گیا۔

"ن نہیں، نہیں۔ نہیں۔ یہ خط میں نے نہیں لکھے، ہرگز نہیں۔"

پھر وہ تڑ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ صابن والا برش فرش پر لڑھک گیا۔ مگ کا پانی چھلک گیا اور وہ بوکھلا گئے۔

☆☆☆

"یہ بات یہاں کون جانتا ہے کہ تم میرے دوست ہو۔"

"یہ بات تو یہاں بے شمار لوگ جانتے ہیں۔ میں لوگوں کو فخریہ بتایا کرتا ہوں کہ اس ملک کے مشہور و معروف سراغ رساں انسپکٹر جمشید میرے دوست ہیں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"دراصل تمہارا طرزِ تحریر کالج کے زمانے میں بھی دیکھا ہوا تھا۔ خیال آیا، اب اس میں فرق آ گیا ہوگا۔ اسی لیے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ خط تمہارے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔"

"بالکل نہیں، میری تحریر تو اس سے بالکل مختلف ہے۔ کہو تو لکھ کر دکھا دوں۔"

"ارے، نہیں بھئی، اس کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔"

"اتنی جلدی بھئی، آج دوپہر کا کھانا تو کم از کم میرے ساتھ کھا لیتے۔ ناشتا تو تم نے جہاز میں کر ہی لیا ہوگا۔"

"ہاں بالکل، تم دوپہر کے کھانے کی فکر نہ کرو، شکریہ۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید دروازے کی طرف مڑے۔ سب نے ان کا ساتھ دیا۔

"یہ کچھ اچھی بات نہیں جمشید، تم آ کر ذرا دیر بیٹھے ہی نہیں۔" ارشد لطیفی نے پیچھے سے کہا۔

"کسی روز آ کر بہت دیر بیٹھوں گا، فکر نہ کرو۔"

"بھئی، اتنی زحمت کی ضرورت نہیں، میں خود ہی ہوٹل میں آ کر تم سے مل لوں گا۔ بس تم فون پر اپنے ہوٹل کا نام بتا دینا۔"

"ہوٹل کا نام تو ابھی نوٹ کر لو، ہم پہلے ہی ہوٹل سن رائز میں کمرے بک کرا چکے ہیں۔"

پہاڑی پر مکان

انسپکٹر جمشید تیزی سے اس پر جھکے۔ پہلے تو اسے جھنجوڑا، پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، لیکن لطیفی کو ہوش نہ آ سکا۔ آخر ڈاکٹر کو فون کرنا پڑا۔ بیگم لطیفی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ ان کے صرف ایک بیٹا تھا، وہ بھی دوسرے شہر میں کالج کے ہوسٹل میں داخل تھا۔ یہاں یہ دونوں ہی رہتے تھے۔ گھر میں کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ ملازم ہوتا بھی کیسے، اُسے تو تنخواہ دینا پڑتی ہے۔

ڈاکٹر نے آتے ہی اسے ایک انجکشن دیا، تب کہیں جا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔

"ارے بھئی لطیفی، یہ کیا ہو گیا تمہیں۔ ہم تمہارے ہاں رہنے تو نہیں آئے۔ رہنا تو ہمیں ہوٹل میں ہے۔ ہم تو ان خطوط کے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔"

"کیا کہا، ہوٹل میں رہنا ہے، میرے ہوتے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"

لطیفی فوراً اٹھ بیٹھا۔ یوں لگا، جیسے مردہ جسم میں جان آ گئی ہو۔

"نہیں بھئی، رہیں گے ہم ہر حال میں ہوٹل میں ہی۔ اچھا تو یہ خطوط تم نے نہیں لکھے۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"اوہو، اچھا۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" جیسے کہہ رہا ہو پہلے کیوں نہیں بتایا، میں بے ہوش ہونے سے بچ جاتا۔ اب ڈاکٹر کا بل ادا کرنا پڑے گا۔

اور وہ مسکراتے ہوئے ٹیکسیوں میں بیٹھ گئے۔ ابھی انہوں نے ٹیکسیوں کو فارغ نہیں کیا تھا، سامان بھی نہیں اتارا تھا، کیوں کہ جانتے تھے، اس گھر میں تو رہ ہی نہیں سکیں گے، وہ تو یہاں خطوط کے بارے میں معلوم کرنے چلے آئے تھے اور یہ بات انہیں معلوم ہو چکی تھی کہ خطوط ارشد لطیفی نے نہیں لکھے تھے۔

"کیوں بھئی، اب کیا کہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی چلنے کے بعد کہا۔

پہلی ٹیکسی میں وہ چاروں تھے۔ دوسری میں خان رحمان اور ان کے بچے۔ تیسری میں پروفیسر داؤد اور شائستہ۔

"یہ کہ آپ کے اندازے بہت کم غلط ہوتے ہیں۔" محمود بولا۔

"میں اپنے اندازے کی بات نہیں کر رہا، میں تو یہ کہہ رہا ہوں، اب اس معاملے کے بارے میں تم نے کیا خیال قائم کیے ہیں۔"

"یہی کہ ہمارے خلاف سازش ہی کی گئی ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور سازش کرنے والا ابھی تک دور دور تک نظر نہیں آیا۔ حالانکہ میں محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی تیز نظریں بدستور ہماری نگرانی کر رہی ہیں۔"

"اوہ، ابا جان، آپ تو ہمیں ڈرائے دے رہے ہیں۔" فرزانہ بوکھلا اٹھی۔

"خیر، اس میں ڈرنے کی تو کوئی ضرورت نہیں۔"

"آخر، وہ کیا چاہتا ہے۔" محمود نے اٹک اٹک کر کہا۔

"کچھ نہ کچھ ضرور چاہتا ہے، ورنہ اس طرح ہمیں اس وادی میں نہ کھینچ لاتا۔" فاروق نے کہا۔

"کتنا شان دار جواب ہے۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ٹیکسی اب ایک الگ تھلگ سی پہاڑی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ پہاڑی کا پھیلاؤ زیادہ نہیں تھا، بس وہ ایک بہت بڑا ٹیلا سا تھی۔ اور اس پہاڑی پر ایک مکان بنا ہوا تھا۔ پہاڑی کے چاروں طرف ہموار میدان تھا۔ اچانک دل دوز چیخیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں۔ انہوں نے صاف محسوس کیا کہ چیخیں پہاڑی پر بنے اس مکان میں سے آئی تھیں۔ محمود کے منہ سے فوراً نکلا:

"روکو، بھئی روکو۔"

لیکن ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار اور بڑھا دی۔ اس کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔

"یہ کیا۔ میں نے تمہیں روکنے کے لیے کہا اور تم نے رفتار اور تیز کر دی۔" محمود بھنا اٹھا۔

"ہم۔ ہم یہاں نہیں رک سکتے۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"کیوں، کیا بات ہے، کیا تم نے چیخوں کی آواز نہیں سُنی؟"

"ہاں، ضرور سنی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس مکان سے ایسی چیخیں اکثر سنائی دیتی ہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

"کیا مطلب، کیا کسی کو معلوم نہیں کہ یہ چیخیں کیوں سنائی دیتی ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں، کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ مکان میں جا کر دیکھ سکے، یہ مکان مدتوں سے بند پڑا ہے۔ وادی میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں جو یہ بتا سکے کہ یہ مکان آخر ہے کس کا، کیا اس میں کبھی کوئی رہتا تھا۔"

"اور یہ چیخیں بھی کیا ہمیشہ سے سنائی دیتی ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں، چیخیں تو ابھی ایک سال سے سنائی دینے لگی ہیں، ایک سال پہلے کبھی کسی نے اس مکان سے آتی آوازیں نہیں سنی تھیں۔ وادی کے لوگ اس مکان سے بہت خوف زدہ رہنے لگے ہیں۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔"

"ہوں، تب تو اس مکان کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ہمیں یہیں اتار دیں۔" انسپکٹر جمشید بارعب لہجے میں بولے۔

"جی کیا فرمایا، یہیں اتار دیں؟" ڈرائیور حیران رہ گیا۔

"ہاں، لیکن ہمارا سامان ہوٹل سن رائز میں پہنچا دیں یا شاید ہمارے کچھ ساتھی بھی یہاں سے ہوٹل ہی جانا پسند کریں گے، بہر حال ٹیکسی روک لیں۔"

"میں یہاں ٹیکسی نہیں روک سکوں گا۔ تقریباً سو میٹر اور نکل جانے دیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"حیرت ہے۔ اس مکان کے آس پاس سے گزرنے والوں پر بھی کوئی آفت ٹوٹی ہے کبھی؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں پاس سے گزرنے والے ایسے لوگ جنہوں نے اس مکان کے سامنے رکنے یا اترنے کی کوشش کی، شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اور کئی ہفتوں بعد کہیں جا کر ان کا بخار اُترا۔ یہ بات وادی میں بہت مشہور ہے۔"

"خیر، سو میٹر دور ہی سہی۔"

ایک منٹ بعد اگلی ٹیکسی رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے آنے والی ٹیکسیاں بھی رک گئیں۔

"کیا بات ہے جمشید، خیر تو ہے؟" خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

"خان رحمان، آپ لوگوں نے اس پہاڑی مکان سے نکلتی چیخیں سنی

تھیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں، سنی تو تھیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر میں اس مکان کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ تم لوگ ہوٹل پہنچو، ہم جلد ہی پہنچ جائیں گے۔"

"کم از کم میں نہیں جاؤں گا ہوٹل۔ پروفیسر صاحب بچوں کو لے کر چلے جاتے ہیں۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہم بھی نہیں جائیں گے، بس ہمارا سامان جائے گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"آپ لوگ عجیب ہیں، بلاوجہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔" پہلے ڈرائیور نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ ہم لوگوں کی بہت پرانی عادت ہے۔ بلاوجہ موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ خراب عادت یہ ہے کہ موت کے منہ میں جانے کے بعد واپس بھی چلے آتے ہیں۔ ہے کوئی تک۔"

"جی کیا فرمایا؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"پتا نہیں بھائی، میں بعض اوقات بلاوجہ ہی کچھ فرما جاتا ہوں۔" فاروق نے کہا۔

"آپ لوگ ہمارا سامان ہوٹل تک پہنچا دیں، ہم خود ہی آتے رہیں گے۔ یہ لیجیے بل۔" انسپکٹر جمشید نے جیب سے بٹوا نکالتے ہوئے کہا، لیکن خان رحمان اس سے پہلے ہی پیسے نکال چکے تھے۔

"خان رحمان، میں تمہاری اس عادت سے بہت تنگ ہوں۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

’’یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔‘‘ خان رحمان چہک کر بولے۔
اب وہ واپس مڑے۔ اور پہاڑی مکان کی طرف بڑھنے لگے۔ تینوں ٹیکسی ڈرائیور پہلے تو بدحواسی کے عالم میں انہیں اس طرف جاتے دیکھتے رہے، پھر ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا:

’’اب بھی وقت ہے، واپس آجائیے۔ اس مکان کے قریب جانا خطرناک ہے۔‘‘

لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ قدم اٹھاتے رہے۔ یہاں تک کہ پہاڑی کے نزدیک پہنچ گئے۔ مکان کا دروازہ سڑک کی طرف تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت بڑھی کہ دروازے تک جانے کا کوئی راستا نہیں تھا۔

’’لیجیے، یہاں تو اندر داخل ہونے کا راستا ہی نہیں ہے۔‘‘ فاروق نے منہ بنایا۔

’’ہمیں پہاڑی کا چکر لگانا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے، راستا دوسری طرف ہو۔‘‘

’’کہیں ہم بلاوجہ کوئی نئی مصیبت تو مول نہیں لینے والے۔ میرا مطلب ہے، ایک مصیبت تو پہلے ہی مول لے چکے ہیں۔‘‘ فاروق نے خدشہ ظاہر کیا۔

’’چلو، جہاں ایک مول لے چکے ہیں، وہاں ایک اور سہی۔‘‘ فرزانہ مسکرائی۔

’’تمہارا کیا ہے، تم تو ہر وقت مصیبتیں مول لینے پر تلی رہتی ہو۔‘‘ فاروق نے تلملا کر کہا۔

’’اور محمود کے متعلق کیا خیال ہے؟‘‘ فرزانہ نے بُرا مانے بغیر کہا۔

’’یہ حضرت ہیرو بننے کے چکر میں رہتے ہیں۔‘‘

’’اب ذرا اپنے بارے میں بھی خیال ظاہر کردو، تم خود کس چکر میں رہتے

ہو؟‘‘ محمود جل کر بولا۔

’’مم، میں۔ یعنی کہ میں، بس اب میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہوگی اور مجھے اس سے نفرت ہے۔‘‘ اس نے منہ بنایا۔ جواب میں محمود اور فرزانہ نے اس سے بھی بُرا منہ بنایا۔

’’تم لوگوں کے درمیان بُرا سا منہ بنانے کا مقابلہ تو نہیں ہو رہا۔‘‘ حامد نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔

’’تم بھی شوق سے حصہ لے سکتے ہو۔‘‘ فاروق بھلا کہاں رکنے والا تھا۔

’’اب اس غریب کی ٹانگ تو نہ لو۔‘‘ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

’’جی، میں نے تو نہیں لی ٹانگ وانگ۔‘‘ فاروق بولا۔

’’انکل، وہ رہا راستا۔‘‘ شائستہ چلائی۔ سب نے اس طرف دیکھا، پہاڑی کو تراش کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور یہ سیڑھیاں پہاڑی کے اوپر تک جا رہی تھیں، جہاں مکان کا دروازہ بھی تھا۔

’’ویری گڈ، آؤ آؤ اوپر چلیں۔‘‘ انسپکٹر جمشید خوش ہو گئے۔

’’آخر ہم اوپر جا کر کیا کریں گے، یہ ایک آسیب زدہ مکان ہے اور بس۔‘‘ فاروق بولا۔

’’اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم نیچے ہی رہ کر ہمارا انتظار کرلو۔‘‘ فرزانہ نے فوراً کہا۔

’’نا بابا، انتظار کرنا اور بھی مشکل ہے۔‘‘

’’میرا مشورہ یہ ہے، اوپر صرف میں جاؤں۔ باقی سب لوگ نیچے رہیں۔ اگر اوپر کوئی خطرہ نہ ہوا تو سب کو بلا لوں گا۔‘‘ انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

’’جی نہیں، کم از کم ہم تینوں آپ کے ساتھ ضرور چلیں گے۔‘‘ فرزانہ نے

انکار میں سر ہلایا۔

"اور میں بھی نیچے نہیں رہ سکتا۔" خان رحمان بولے۔

"جمشید کی تجویز بہت معقول تھی۔ خیر، میں بچوں کے ساتھ نیچے رہ جاتا ہوں، تم لوگ اوپر ہو آؤ۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان ان کے پیچھے چلے نہ جانے کیوں، اب ان کے دل دھک دھک کرنے لگے تھے۔

"ابا جان، اوپر ضرور کچھ ہے۔" فرزانہ نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"تم یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہو۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"کپکپا کر۔" فاروق بول اٹھا اور فرزانہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ سیڑھیاں اتنی چوڑی تھیں کہ دو آدمی برابر برابر ان پر چڑھ سکتے تھے اور اس وقت فاروق اور فرزانہ ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ محمود اور خان رحمان ان سے اوپر تھے اور سب سے آگے انسپکٹر جمشید۔

"جوں ہی میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

"تب پھر اوپر ضرور تمہارا وہم موجود ہے۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"وہمی ہو گے تم خود۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخا اور اتفاق سے یہ پاؤں فاروق کے پاؤں پر پڑا۔ وہ بھنا اٹھا۔

"تت، تم نے۔ تم نے میرے پیر پر پیر مارا۔" اس نے غصے میں آ کر کہا۔

"نن نہیں، جان بوجھ کر ایسا نہیں ہوا۔" فرزانہ نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

"خیر، سمجھ لوں گا اوپر چل کر۔"

"اوپر چل کر تو آسیب سے سمجھنا۔" فرزانہ مسکرائی۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید سب سے اوپر والی سیڑھی پر پہنچ گئے۔ انہوں نے سُنا، وہ کہہ رہے تھے:

"عمارت تو اندر سے بالکل خالی معلوم ہوتی ہے۔"

"اب جن بھوت اور چڑیلیں تو آپ کو نظر آنے سے رہیں۔" فاروق نے کہا۔

"خیر آؤ، دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے وہ چاروں بھی آ گئے۔ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا۔ چاروں کمروں میں چاروں طرف دروازے تھے۔ ان میں سے ہوا بہت تیزی سے اندر آ رہی تھی۔ کھڑکیاں بھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا۔ باورچی خانے میں پانی کا نل بھی موجود تھا۔ انسپکٹر جمشید نے نل چلا کر دیکھا تو پانی گرنے لگا۔

"حیرت ہے، یہاں نل کیسے لگ گیا۔ موٹر تو لگی ہوئی نہیں ہے اور نہ میونسپلٹی کا پانی کا پائپ آتا نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ میونسپلٹی کا ہی پانی ہو اور ہمیں پائپ نظر نہ آیا ہو۔ ویسے ایک بات ہے، مکان ہے بہت ہوادار۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

"پھر کیا خیال ہے ابا جان؟" فرزانہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ جواب میں انسپکٹر جمشید مسکرائے اور بولے:

"بہت جلد میرا مطب سمجھ جاتی ہو۔"

"کیا مطلب، کیا مطلب ہے تمہارا؟" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے، ہم کیوں نہ ہوٹل کی بجائے اسی مکان میں

رہیں۔"

"لیکن کیا خبر، یہ کس کا مکان ہے۔ بغیر اجازت رہنا تو ٹھیک نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"معلوم کرلیں گے اور کرائے پر لے لیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، کیا اب چلیں؟"

"ہاں، جانا تو پڑے گا ہی۔ کاش، ہم نے سامان نہ بھیجا ہوتا۔ خیر، لے آئیں گے اٹھا کر۔"

وہ نیچے اتر آئے۔ پروفیسر داؤد اور بچے پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیوں انکل کیا رہا؟" سرور نے بے چین ہو کر پوچھا۔

اوپر کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگوں نے بلاوجہ ہی اسے آسیب زدہ قرار دے رکھا ہے۔ میں نے سوچا ہے، ہم ہوٹل کی بجائے یہاں رہیں گے۔"

"کیا کہا، ہم اس مکان میں رہیں گے، لیکن کھائیں پئیں گے کہاں سے؟"

"بازار سے سب کچھ خرید لائیں گے۔ کوئی خانساماں مل سکا تو اسے بھی لے آئیں گے۔ ورنہ خود کھانا تیار کریں گے۔ اصل زندگی تو یہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"تجربہ رہے گا پر لطف۔" خان رحمان نے کہا، پھر جلدی سے بولے: "تو کیوں نہ فون کر کے ظہور کو بلا لیا جائے۔"

"یہ بھی مناسب رہے گا اور اگر دونوں بیگمات آنا چاہیں تو انہیں بھی آنے دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے، ہم ہوٹل سے فون کر دیں گے۔"

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس پر پروفیسر داؤد، حامد، سرور، ناز اور شائستہ کو بھیج دیا گیا۔ کچھ اور آگے چل کر انہیں دو ٹیکسیاں اور مل گئیں اور وہ ہوٹل سن رائز پہنچ گئے۔ ہال میں ان کے ساتھی انتظار کرتے ملے۔ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔

"جمشید احمد کے نام سے ہم نے چار کمرے بک کرائے تھے۔"

"جی، جی ہاں، جی ہاں۔"

"اور تین ٹیکسی ڈرائیور ہمارا سامان ابھی ابھی پہنچا گئے ہوں گے۔"

"جی سامان، نہیں تو۔"

"کیا کہا، سامان نہیں پہنچا؟" انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔

"جی نہیں۔"

"حیرت ہے، ٹیکسی ڈرائیور کہاں رہ گئے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"آپ نے سامان ٹیکسی ڈرائیوروں کو دے کر بھیجا تھا؟" کاؤنٹر کلرک نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔"

"تب تو وہ گیا۔" وہ بولا۔

"کیا مطب، کہاں گیا؟"

"اس شہر کے ٹیکسی ڈرائیور بہت اچکے ہیں۔ موقع مل جائے پھر نہیں چھوڑتے۔"

"کمرے آپ ہمارے نام ہی بک رہنے دیں۔ ہم سامان وغیرہ کا انتظار کر کے آ جائیں گے، اور ہاں، ہم ذرا ایک دو فون کریں گے۔"

”ضرور جناب، فون کا بل آپ کے بل میں شامل کر دیا جائے گا۔“ اس نے گویا خبردار کیا۔

”ضرور ضرور، فکر نہ کرو۔“ خان رحمان نے کہا اور گھر کے نمبر ملائے۔ ظہور اور بیگم کو ہدایات دیں اور پھر انسپکٹر جمشید کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ اب ریسیور انسپکٹر جمشید نے لیا اور بیگم کو ہدایات دیں۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں، پہاڑی پر جو آسیب زدہ مکان ہے، وہ کس کا ہے؟“

”جی مسٹر کاشف مرزا کا ہے، کیوں؟“

”ایسے ہی۔ ان کا پتا بتا سکتے ہیں آپ۔“

”احسان کالونی میں رہتے ہیں، یہاں سے تین کلومیٹر دور ہے یہ کالونی۔“ اس نے کہا۔

”بہت بہت شکریہ، آیئے بھئی چلیں۔“

”سر، آپ کو چاروں کمروں کا ایک ہفتے کا کرایہ اڈوانس دینا ہوگا۔“ کلرک جلدی سے بولا۔

”ارے ہاں، یہ تو ہم بھول ہی گئے۔“ خان رحمان رک کر بولے اور پھر جلدی جلدی کرایہ ادا کر دیا۔ باہر نکل کر انسپکٹر جمشید بولے:

”ہم ذرا آسیب زدہ مکان کے مالک سے ملنے جا رہے ہیں، اگر آپ لوگ یہاں ٹھہرنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”جی نہیں، سب ساتھ جائیں گے۔“ پروفیسر داؤد نے کہا۔

اور وہ احسان کولونی پہنچے۔ ایک گھر کے دروازے پر وہ دو ٹیکسیوں سے اترے۔ انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ جلد ہی ایک گنجے سر والے آدمی نے

دروازہ کھولا اور اتنے بہت سے آدمیوں کو دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔

”پہاڑی والا مکان آپ کا ہے؟“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”ہاں، مجھ بدنصیب کا ہی ہے۔“ اس نے سرد آہ بھری۔

”اس میں بدنصیبی کی کیا بات۔ وہ تو بہت پرفضا مکان ہے اور ہم اسے کرائے پر لینے آئے ہیں۔“

”کیا فرمایا، آپ اسے کرائے پر لینے آئے ہیں؟“

”ہاں بالکل، کیا آپ اسے کرائے پر نہیں دیتے۔“

”کیوں نہیں، ضرور دیتا ہوں، لیکن کسی زمانے میں دیتا رہا ہوں، اب نہیں۔ اب تو کوئی اسے کرائے پر لینے آتا ہی نہیں۔“ اس نے پھر ٹھنڈا سانس چھوڑا۔

”لیجیے، غور سے دیکھ لیجیے، ہم آ گئے ہیں۔“ فاروق نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”آیئے، اندر تشریف لے آیئے۔ شاید آپ کو اس مکان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔“ اس نے ان کے لیے راستا چھوڑتے ہوئے کہا۔

وہ اندر داخل ہو گئے اور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

”کیا آپ نہیں جانتے، وہ مکان آسیب زدہ ہے؟“

”بالکل جانتے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اور اس کے باوجود آپ اسے کرائے پر لینا چاہتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بالکل، کیوں کہ ہمیں وہ بہت ہی زیادہ پسند آیا ہے۔ اس قدر شاندار مکان تو شاید اس پورے علاقے میں نہیں ہوگا۔“ خان رحمان بول اٹھے۔

”آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ لوگوں کا خیال بھی پہلے یہی تھا، لیکن اب نہیں۔ اب تو وہ صرف ایک آسیب زدہ مکان ہے، جس میں سے چیخوں کی آوازیں

آتی ہیں اور کوئی اسے کرائے پر لینے کو آمادہ نہیں ہوتا۔ میں ہر موسم بہار پر کئی ہزار روپے کما لیتا تھا اور ان ہی پیسوں سے سارا سال گزارا کر لیتا تھا، کیونکہ میں ایک معذور آدمی ہوں میری ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔ پہلے اچھا بھلا معمار تھا، لیکن جب سے ٹانگ ٹوٹی ہے، یہ کام نہیں ہو پاتا۔ اچھے وقتوں میں اس چٹان کو خرید کر وہ مکان اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اس میں رہائش بھی اختیار کر لی تھی۔ یہ مکان جس میں آپ اس وقت بیٹھے ہیں، باپ دادا کے زمانے کا ہے۔ اسے خالی کر کے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پہاڑی والے مکان میں چلا گیا تھا، لیکن جب یہ ٹانگ بے کار ہوئی تو پھر اسی مکان میں واپس آ گیا اور پہاڑی والا مکان کرائے پر دینے لگا۔ اس طرح میری گزر بسر ہونے لگی۔ اب کچھ سالوں سے حالت پھر رہی ہے۔ اچانک ہی یہ مکان آسیب زدہ مشہور ہو گیا اور اب اسے کوئی کرائے پر نہیں لیتا۔ تین سال بعد آپ لوگ آئے ہیں، جو اسے کرائے پر لینا چاہتے ہیں، لیکن میری زبانی حالت سُن کر آپ نے یقیناً اپنا ارادہ بدل لیا ہو گا اور ٹھیک بھی یہی ہے۔ اب بھلا آسیب سے کون مقابلہ کرے۔" وہ روانی کے عالم میں کہتا چلا گیا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی فاروق بول اٹھا:

"یہی تو مصیبت ہے، ان تمام معلومات کے باوجود ہم وہ مکان کرائے پر لینا چاہتے ہیں، آپ کرایہ طے کر لیں، ہم کم از کم ایک ہفتے تک اس میں رہیں گے۔"

"آپ جو کرایہ جی میں آئے دے دیجیے گا۔ میرے لیے کیا یہ کم خوشی کا مقام ہے کہ تین سال بعد کوئی اسے کرائے پر لے گا۔"

"تو پھر ہم آپ کو ایک ہزار روپے دے دیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"ایک ہزار روپے آٹھ دن کے۔" کاشف مرزا نے جلدی سے کہا۔

"چلیے، اگر یہ کم ہیں، تو دو ہزار سہی۔" خان رحمان نے کہا۔

"دو ہزار روپے۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"اوہو، آخر آپ کتنے چاہتے ہیں۔ اگر دو ہزار بھی کم لگتے ہیں تو تین ہزار سہی۔"

"اف خدا، میں کیا سن رہا ہوں۔ آپ آٹھ دن کے تین ہزار روپے دیں گے۔" اس مرتبہ اس کی آواز کپکپا اٹھی۔

"ہاں بالکل، اگر یقین نہیں تو ابھی دیے دیتے ہیں۔ خان رحمان تین ہزار دے دو بھئی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھا۔" انہوں نے کہا اور تین ہزار روپے گن کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"رسید لکھ دیں اور یہ بھی لکھ دیں کہ آپ اپنا مکان آٹھ روز کے لیے ہمیں دے چکے ہیں۔ آج کی تاریخ ڈال دیں۔"

"اچھ۔ اچھا۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

گنے بغیر ہی اس نے نوٹ جیب میں رکھ لیے اور پھر رسید لکھنے کے بعد بولا:

"واضح رہے، مکان آسیب زدہ ہے۔ اس میں آپ کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"فکر نہ کریں۔ ہم اب بازار سے کچھ سامان لینے جائیں گے، کیونکہ ہمارا سامان ٹیکسی ڈرائیور لے گئے ہیں۔"

"جی کیا کہا، سامان ٹیکسی ڈرائیور لے گئے ہیں۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔ خیر اس بات کی فکر نہ کریں۔ ہم اور سامان خرید لیں گے۔ اب یہ بتا دیں کہ پہلے پہل کس طرح معلوم ہوا کہ مکان آسیب زدہ ہو گیا ہے۔"

"مکان ایک صاحب نے کرائے پر لیا تھا۔ دوسرے دن وہ چیختے چلاتے میرے پاس پہنچے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی بولے:

"اے مرزا صاحب، میں آپ پر دعویٰ کر دوں گا۔ آپ نے آسیب زدہ مکان کرائے پر دیا ہے۔ میری زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ خدا جانے کس کس طرح نکل کر یہاں پہنچا ہوں وغیرہ۔ اس کے بعد تو آن کی آن میں میرا مکان آسیب زدہ مشہور ہو گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ تنگ آ کر میں نے خود اس میں رہنے کا فیصلہ کیا، تاکہ یہ مکان کرائے پر دے کر اپنی گزر بسر کر سکوں۔ میں تھوڑا بہت سامان اور بیوی بچوں کو لے کر اس میں چلا گیا، لیکن جناب، سچ تو یہ ہے کہ ایک رات مشکل ہی رہ سکا۔ کبھی کوئی رونے لگتا ہے، کبھی سسکیاں سنائی دینے لگتی ہیں، کبھی کسی کے گانے کی آواز اور کبھی مسلسل چیخوں کی آوازیں۔ ہم تو وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر کوئی میرا مکان کرائے پر لینے نہیں آیا۔ تین سال بعد آپ آئے ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مکان آسیب زدہ ہی ہے۔ مجھ الزام نہ دیجیے گا۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"فکر نہ کریں۔ آپ کو اور تو کچھ دیں یا نہ دیں، الزام ہرگز نہیں د گے۔" فاروق نے کہا۔

"جی کیا مطلب؟" وہ اس کے عجیب جملے پر حیران رہ گیا۔

"اس کی باتوں کا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہے جناب۔" فرزانہ نے کٹے لہجے میں کہا۔

"آؤ بھئی، اب چلیں۔ ہمیں ابھی ٹیکسی ڈرائیوروں کے خلاف رپو بھی تو درج کرانی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"تو پھر سامان خریدنے سے پہلے رپورٹ درج کرانی چا

پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں، یہی کریں گے۔"

وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ سب انسپکٹر نے انہیں ہونقوں کی طرح دیکھا:

"خیر تو ہے، اتنے بہت سے افراد جمع ہو کر کیوں آ گئے؟"

"تین ٹیکسی ڈرائیور ہمارا سامان لے گئے ہیں۔ رپورٹ درج کرانی ہے۔"

"ایک تو میں اس شہر کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔ آئے دن لوگوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ خیر جناب، آپ لوگ تشریف رکھیے اور تفصیل لکھوائیے۔ ٹیکسیوں کے نمبر تو نوٹ کر لیے ہوں گے آپ نے؟"

"کم از کم ایک ٹیکسی کے نمبر تو بتا سکیں گے، کیونکہ اس کا نمبر بہت آسان اور نہ بھولنے والا تھا۔"

"اور وہ کیا تھا؟"

"جے بی ۶۶۶۔" وہ بولے۔

"ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی ٹیکسی ڈرائیور جب کوئی واردات کرنے لگتے ہیں تو جعلی نمبر پلیٹ لگا لیتے ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ان لوگوں کو پکڑنا آپ کا کام ہے۔"

"ہاں، وہ تو خیر ہے۔ اچھا یہ بتائیے، مال کتنے کا گیا ہے؟"

"تقریباً دو لاکھ روپے کا۔" خان رحمان نے کہا۔

"کیا کہا، دو لاکھ روپے کا سامان؟"

"صرف سامان دو لاکھ روپے کا نہیں، میرے سوٹ کیس میں نقدی بھی

تھی۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے۔ باقی سارے سامان کا اندازہ پچاس ہزار کا ہے۔ تمام
چیزیں قیمتی تھیں۔"

"حیرت ہے، آپ تو ذرا بھی فکر مند نظر نہیں آ رہے۔"

"فکر مند نظر آ کر کیا کریں۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔" فاروق نے بڑی
بوڑھیوں کیطرح کہا۔

"خیر، پوری تفصیل لکھوا دیں۔"

انسپکٹر جمشید نے تفصیل لکھوادی، پھر دستخط کیے اور چلے آئے۔ بازار سے
ضروری سامان خریدا اور پھر پہاڑی والے مکان میں پہنچ گئے۔ محمود کو ہوٹل سن
رائز میں چھوڑ دیا گیا تھا، کیونکہ دونوں بیگمات اور ظہور کو بھی پہنچنا تھا۔ شام تک وہ بھی
پہنچ گئے۔ محمود انہیں لے کر پہاڑی مکان میں پہنچا، تو سب لوگ سامان کو ترتیب سے
رکھنے میں مصروف تھے۔

"بس اب آپ لوگ رہنے دیں، یہ ہم کر لیں گے۔ آپ اپنا کام
کریں۔" بیگم جمشید مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اپنا کام۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"جی ہاں، اپنا کام۔ یعنی جاسوسی۔" شہناز بیگم بول پڑیں۔

"لیکن اس مکان میں ہمارے لیے کوئی اپنا کام نہیں۔ ارے ہاں، کام تو
واقعی نکل آیا۔ آؤ بھئی، ہم اس کے در و دیوار کا جائزہ لیں اور چھت پر جا کر دیکھیں،
شاید بھوتوں کا پروگرام معلوم ہو جائے۔"

"کیا کہا، بھوتوں کا پروگرام۔" بیگم جمشید حیران رہ گئیں۔

"ہاں بیگم، بات دراصل یہ ہے کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ ہم نے اس
میں ایک ہفتہ گزارنے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اسی لیے تم لوگوں کو بلایا گیا ہے، تاکہ

کھانے وانے کی دقت نہ ہو۔"

"آسیب زدہ۔ ارے باپ رے۔" شہناز بیگم گھبرا گئیں۔

"آپ کو ہمیں آسیب زدہ مکان میں ہی بلانا تھا۔ کیا ہم اسی قابل رہ گئی
ہیں۔" بیگم جمشید بھی بُرا مان کر بولیں۔

"اب کیا کیا جائے امی جان، آسیب تو ہمیں کھانا پکا کر دے نہیں سکتے
تھے۔" فاروق بولا۔

انہوں نے مکان کا جائزہ شروع کیا۔ چھت پر چڑھنے کے لیے لکڑی کی
سیڑھی موجود تھی۔ وہ چھت پر پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں ایک
ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا اور اس میں سے چند تار نکل کر کمروں کی طرف جا رہے تھے جو
باریک سوراخ کر کے نیچے پہنچائے گئے تھے۔

"ارے، یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ ایسے کام تو بچے بھی کر لیتے ہیں۔ حیرت
ہے، لوگ اس عمارت سے یونہی ڈرتے رہے۔ کسی نے اوپر چڑھ کر دیکھا تک نہیں۔"
انسپکٹر جمشید بولے۔

"سوال تو یہ ہے، کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ بھی چند روز سے
نہیں، تین سال سے؟" محمود نے کہا۔

"شاید وہ اس مکان میں مفت رہ رہا ہے۔ اب اسے کرایہ نہیں دینا پڑتا۔"
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

"پورے واقعات پر غور کرو، فوراً جان لوگے کہ میں کس کی بات کر رہا
ہوں۔" وہ بولے۔

ٹیپ ریکارڈر کو جوں کا توں چھوڑ کر وہ نیچے آئے۔ کمروں کی دیواروں میں

چھت کے نزدیک انہیں طاق نما سوراخ نظر آئے۔ وہ سمجھ گئے کہ سپیکر ان سوراخوں میں موجود ہیں۔

"لو بیگم، ہم نے بھوتوں کا پتا چلا لیا۔ اب تمہیں ڈرنے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ تو حد درجے سیدھا سادا ثابت ہوا ہے، گویا اس مرتبہ ہم خوب تفریح کر سکیں گے۔"

"لیکن ابا جان، ہمیں وہ خطوط کس نے لکھے تھے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"کم از کم بھوتوں نے تو لکھے نہیں تھے، کیونکہ بھوت یہ بات تو جانتے ہی ہوں گے کہ اگر ہم یہاں آ گئے تو ان کا کھیل خراب ہو جائے گا۔"

"آؤ میرے ساتھ۔ میں ابھی اس معاملے کو برابر کیے دیتا ہوں۔"

"لیکن کہاں؟" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"مالک مکان کے پاس۔" وہ بولے۔

آدھ گھنٹے بعد وہ پھر کاشف مرزا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک دونوں فریقوں میں سے کسی نے بھی منہ سے کوئی لفظ نہیں نکالا تھا۔ انسپکٹر جمشید جان بوجھ کر خاموش تھے۔ آخر کاشف مرزا سے رہا نہ گیا:

"خیر تو ہے جناب، کیا آپ لوگوں نے مکان میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔" اس کی آواز میں گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔

"نہیں، پہلے تو یہ بتایئے آپ نے ہمیں ارشد لطیفی کے نام سے خطوط کیوں لکھے تھے؟"

"جی کیا فرمایا، ارشد لطیفی کے نام سے آپ کو خطوط کیوں لکھے تھے۔ میں

سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"آپ ارشد لطیفی کو جانتے ہیں نا؟"

"جی نہیں، بالکل نہیں جانتا۔" اس نے کہا۔

"اور آپ ہمیں بھی نہیں جانتے؟"

"جی بالکل نہیں۔ میں نے آپ لوگوں کو تھوڑی دیر پہلے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"

"اچھا، اس کرائے دار کا نام بتا سکتے ہیں، جس نے تین سال پہلے آپ کا مکان کرائے پر لیا تھا اور ایک رات رہ کر ہی بھاگ آیا تھا۔ آ کر اس نے بتایا تھا کہ مکان آسیب زدہ ہے۔"

"جی نہیں، میں بھلا اسے کس طرح جان سکتا ہوں۔ وہ تو یہاں سیر تفریح کی غرض سے آیا تھا۔"

"خیر، اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو ہم آپ کو یہ خوش خبری سنا دیتے ہیں کہ آپ کے مکان کو بھوتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا جائے گا۔"

"جی، کیا واقعی؟"

"جی ہاں، یہ بالکل درست ہے، کیونکہ ہم بھوت اسپیشلسٹ ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا اور وہ اسے گھور کر رہ گئے۔

باہر نکلے، تو محمود نے کہا:

"گویا معاملہ سیدھا سادا ثابت نہیں ہوا۔"

"کیوں، تم نے یہ کس طرح کہہ دیا؟" انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے یہی خیال قائم کیا تھا نا کہ کاشف مرزا نے ارشد لطیفی کے نام

سے ہمیں خط لکھے۔ وہ چاہتا تھا، ہم یہاں سیر کی غرض سے پہنچ جائیں اور سیر کے دوران یا وادی کے لوگوں کی زبانی اس آسیب زدہ مکان کے بارے میں سن کر اس میں رہنے کا فیصلہ کر لیں۔ مکان پر چھت پر ٹیپ ریکارڈر دیکھ کر آپ نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ کرائے دار جس نے سب سے پہلے آسیب کو چیختے چلاتے سنا، دراصل وہی اس سارے کھیل کی بنیاد ہے، یہ چکر اسی نے چلا رکھا ہے، تاکہ ان میں کرایہ ادا کیے بغیر رہتا رہے۔ یہی سوچا تھا نا آپ نے؟"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ مسکرائے

"لیکن اب جب کہ کاشف مرزا نے کہہ دیا کہ خطوط اس نے نہیں لکھے تو معاملہ ذرا ٹیڑھا ہو گیا۔ سوال یہ پیدا ہو گیا کہ آخر خطوط کس نے لکھے تھے اور کیوں؟"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، آخر کسی کو خطوط لکھ کر ہمیں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟" انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"اور اس موڑ پر آ کر معاملہ الجھ گیا ہے، پیچیدہ ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں بھی حیران تھا، ہمیں سیدھا سادا معاملہ کس طرح مل گیا۔ آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔" فاروق بولا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔ آؤ واپس چلیں۔"

عین اسی وقت انہوں نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ جلدی سے مڑ کر دیکھا تو بیروں کی وردی میں ایک شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ رک گئے۔ نزدیک آنے پر اس نے کہا:

"آپ میں سے جمشید احمد کون ہیں؟"

"میں ہوں۔ کہو، کیا بات ہے؟"

"دارالحکومت سے آپ کا فون آیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد پھر آئے گا۔ میں

ہوٹل سے سیدھا کاشف مرزا کے پاس آیا تھا، انہوں نے بتایا کہ آپ لوگ ابھی ابھی ان کے گھر سے نکل کر گئے ہیں اور یہ کہ آسیب زدہ عمارت کی طرف جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، آؤ چلیں۔ باقی سب لوگ مکان میں پہنچیں۔ میں فون سن کر آتا ہوں۔"

"جی اچھا۔" انہوں نے کہا اور چل پڑے۔ انسپکٹر جمشید بیرے کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔

"اب یہ فون مزید الجھن پیدا کرے گا۔" فاروق بڑبڑایا۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"اس طرح کہ ہمارے ساتھ عام طور پر یہی ہوتا رہتا ہے۔"

"حیرت تو یہ ہے کہ بظاہر بالکل سیدھا سادا معاملہ پیچیدگی اختیار کر چکا ہے۔"

"نہ جانے کیوں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اللہ رحم فرمائے، ایک تو یہ کہ تمہارا دل بات بے بات گھبرانے لگتا ہے۔"

عین اسی وقت ایک سرخ رنگ کی کار ان کے پاس سے گزری اسی وقت ایک لڑکی کی تیز آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"بچ، چاؤ۔ مجھے بچاؤ۔"

انہوں نے بوکھلا کر کار کی طرف دیکھا اور پھر ان کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔

☆☆☆

اب کیا ہوگا؟

ان میں سے سب سے پہلے محمود نے کار کی طرف دوڑ لگا دی: ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی بُت بن کر رہ گیا تھا۔ محمود کے دوڑ لگاتے ہی گویا فاروق اور فرزانہ بھی ہوش میں آ گئے اور اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ اب خان رحمان بھی نہ رہ سکے۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی لوگوں نے بھی دوڑنا شروع کر دیا، لیکن کار کی رفتار کو بھلا وہ کہاں پہنچ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"اف خدا، اب ہم کیا کریں؟" بدستور دوڑتے ہوئے کہا۔

"دوڑتے رہنے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"کاش، کوئی ٹیکسی ادھر آ نکلے۔" فرزانہ بولی۔

اسی وقت پیچھے سے ایک کار کے ہارن کی آواز سنائی دی مڑ کر جو دیکھا تو ٹیکسی تھی۔

"بھئی واہ، اس وقت تو کچھ اور مانگ لیتے، وہ بھی مل جاتا۔" خان رحمان چہکے۔

"ضرورت ہی ٹیکسی کی ہے انکل، کچھ اور کیسے مانگ لیتے اور کچھ اور کا ہم کرتے بھی کیا۔" اس نے کہا۔

اتنے میں ٹیکسی نزدیک آ گئی۔ ساتھ ہی انہوں نے انسپکٹر جمشید کی آواز

میں سنی۔

"یہ۔ یہ تم لوگوں کو کیا ہوا، کیوں بھاگ رہے ہو۔"

"ابا جان، ٹیکسی رکوائیے۔ ہم میں سے ایک دو کو سوار کر لیجیے اور پھر اسی طرف نکل چلیے، جس قدر تیز ممکن ہو۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"روک لو بھئی، نہ جانے کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے ان پر۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

ٹیکسی کے رکتے ہی تینوں بلا کی تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ اور ٹیکسی پھر آگے بڑھ گئی۔

"اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟"

"آگے ایک سرخ کار گئی ہے، ہمیں اس سرخ کار کو پکڑنا ہے۔"

"جب کہ مجھے ہوائی اڈے جانا ہے اور اس قدر جلد جانا ہے، کہ بتا نہیں سکتا۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔

"کیوں ابا جان، خیر تو ہے؟"

"ڈی آئی جی صاحب کی بیٹی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔" انہوں نے کہا اور پھر یہ دیکھ کر ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ یہ خبر سن کر ذرا بھی نہیں اچھلے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت کے ہلکے سے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کپکپاتی آواز میں کہا:

"تت۔ تت تو کیا، سرخ کار میں خان صاحب کی بیٹی کو لے جایا جا رہا ہے؟"

"جی ہاں، یہی بات ہے۔ ہم نے عامرہ کی آواز بالکل صاف پہچانی تھی، بلکہ چہرے کی بھی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چلا اٹھی تھی۔"

''اف خدا، یہ کیا چکر ہے؟'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس سارے چکر کے پیچھے کسی کا چالاک ذہن کام کر رہا ہے۔'' فرزانہ بڑبڑائی۔

اتنے میں انہیں پہاڑی والا مکان نظر آنے لگا۔ کچھ اور آگے چل کر محمود چلا ہی اٹھا:

''ارے، سرخ کار تو وہ رہی، پہاڑی کے دامن میں۔''

''روکو بھئی ٹیکسی۔'' انسپکٹر جمشید بوکھلا کر بولے۔

انہوں نے دیکھا، سرخ کار پہاڑی کے دامن میں کھڑی تھی یعنی اس مکان کے نیچے جو انہوں نے کرائے پر لیا تھا۔ اب اس مکان پر بھی سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ سرخ کار میں کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید بولے:

''میں چاروں طرف خطرات کی بُو سونگھ رہا ہوں۔''

وہ سکتے میں آ گئے۔ اتنا سنسنی خیز لہجہ انہوں نے پہلے شاید ہی کبھی استعمال کیا ہوگا۔ اسی وقت وہ ٹیکسی ڈرائیور سے بولے:

''ڈرائیور صاحب، آپ یہیں ٹھہریں گے۔ آپ کے وقت کی قیمت مل جائے گی۔''

''بہت بہتر جناب۔'' اس نے کہا۔

اور وہ ان تینوں کو لے کر آگے بڑھے۔ جوں ہی سرخ کار کے نزدیک پہنچے، ایک گونجیلی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

''بس انسپکٹر صاحب، اس سے آگے بڑھنا خلاف ادب ہے۔ اس وقت کے بعد کوئی بلا اجازت آگے نہیں آئے گا۔ حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کی زندگی

کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ صورت حال اس وقت پوری طرح ہمارے کنٹرول میں ہے۔ آپ کے گھرانوں کی دو عورتیں اور ایک ملازم ہمارے قبضے میں ہیں۔ ان کی کن پٹیوں پر پستولوں کی نالیں موجود ہیں۔ ڈی آئی جی افتخار احمد کی بیٹی عامرہ بھی اس وقت پستول کی نال اپنی کن پٹی پر محسوس کر رہی ہے۔ ان چاروں کی زندگیاں ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ ایک اشارے میں چاروں کے لاشے تڑپتے نظر آئیں گے اور یہ صرف اسی صورت میں ہوگا، جب کوئی اس جگہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا۔ میرے آدمی چھت پر چاروں سمتوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ رائفلوں کی نالیں جھانکتی آپ لوگ صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ آپ کن حالات کا شکار ہیں۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' انسپکٹر جمشید اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

''افتخار احمد خان کو فوری طور پر اطلاع دی جائے کہ ان کی بیٹی کالمبا وادی میں ایک پہاڑی مکان میں موجود ہے، انہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں، بس صورت حال انہیں بتا دی جائے۔ جب وہ حالات پر غور کر چکیں گے تو ہم اپنا مطالبہ بتا دیں گے اور یہ ان کی مرضی کی بات ہے کہ وہ ہمارا مطالبہ مانتے ہیں یا اپنی بیٹی کی لاش پر آنسو بہانا پسند کرتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے، میں انہیں فون کرنے جاتا ہوں۔''

''ہاں، ضرور جائیں۔ لیکن کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کریں، کیونکہ اس سے نقصان ہو سکتا ہے۔''

''اچھی بات ہے۔''

انہوں نے کہا اور مڑے ہی تھے کہ خان رحمان وغیرہ پر نظر پڑی۔ سب

کے سب پریشان نظر آئے۔

"آپ سب لوگ یہاں ٹھہریں، میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی تک دوڑ کر پہنچے اور پھر اس میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہوٹل پہنچ کر انہوں نے ڈی آئی جی افتخار احمد خان کے نمبر ملائے۔ تھوڑی دیر بعد سلسلہ مل گیا تو وہ بولے:

"ہیلو خان صاحب، کالساوادی سے انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ عامرہ کو یہاں لایا گیا ہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے اسے دیکھا ہے۔ وہ اغوا کرنے والوں کے قبضے میں ہے اور صورتِ حال ایسی ہے کہ ہم بے بس ہیں۔ کوئی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟ جمشید، خدا کے لیے وضاحت کرو۔" خان رحمان تھرتھراتی آواز میں بولے۔

انہوں نے پوری بات بتا دی، پھر بولے:

"آپ یہیں ٹھہریں، کیونکہ اغوا کرنے والوں کی مرضی یہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا مطالبہ بتائیں گے تو میں آپ کو فون کروں گا۔ آپ اس فون کو فارغ رکھنے کی کوشش کریں۔"

"اچھی بات ہے۔ جمشید، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"حوصلہ رکھیے جناب عالی، اللہ اپنا رحم فرمائے گا۔" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ کر باہر نکلے۔ ٹیکسی ڈرائیور اسی جگہ کھڑا ملا۔ ایک بار پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر پہاڑی والے مکان کی طرف روانہ ہو گئے اور پھر مناسب فاصلے پر ٹیکسی سے اترے:

"ڈرائیور صاحب، آپ دیکھ ہی رہے ہیں، صورتِ حال کیا ہے، لہٰذا آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔ آپ کے وقت کی کئی گنا قیمت ادا کر دی جائے گی۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور وہ پھر سرخ کار تک پہنچے۔ سب لوگ وہاں جوں کے توں کھڑے تھے اور ان کی نظریں مکان پر جمی تھیں، جس میں ان کے چار ساتھی قید تھے اور پستولوں کی زد پر تھے۔

"میں نے خان صاحب کو فون کر دیا ہے۔ انہیں حالات پوری طرح بتا دیے گئے ہیں۔ اب آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"بہت جلد تمہیں بتا دیا جائے گا کہ ہمارا مطالبہ کیا ہے، ذرا صبر کرو۔" مکان سے آواز آئی۔ یہ سن کر وہ اپنے دم بخود ساتھیوں کی طرف مڑے

"فرزانہ، تم ترکیبیں بتانے میں بہت ماہر ہو۔ ان حالات میں تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟"

"ہم رات کی تاریکی میں ہی کچھ کر سکتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔" اس نے کہا۔

"لیکن ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہوا۔ اتنا وقت کیسے گزرے گا۔" فاروق نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"دیکھو بھئی، حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حوصلہ ہار کر ہم کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔"

"امی۔ مجھے رہ رہ کر امی کا خیال آ رہا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"صرف امی کا خیال نہ کرو۔ وہاں تمہاری آنٹی اور عامرہ بھی ہیں۔ انکل خان رحمان، خان صاحب کا بھی خیال کرو۔ ہم مجبور ہیں۔ دشمنوں نے اس کام کے لیے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ جہاں کسی طرف سے بھی کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان لوگوں کا مطالبہ کیا ہے۔"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

اسی وقت پہاڑی پر سے آواز آئی:

"آپ لوگ یوں کب تک کھڑے رہیں گے۔ بیٹھ جائیں۔ جو کچھ سوچنا ہے، بیٹھ کر سوچیں۔ آپ بوکھلا کیوں گئے۔ اپ کی زندگی میں تو بہت کٹھن لمحات آئے ہیں۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ چاہتے کیا ہو؟"

"یہ بھی وقت آنے پر بتا دیا جائے گا۔"

"اچھا خیر، لیکن یہ سن لو کہ جو چار افراد تمہارے قبضے میں ہیں، ان میں سے کسی کے ایک خراش بھی نہ آنے پائے، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تمہارا مطالبہ جو کچھ بھی ہے، وہ پورا کر دیا جائے گا۔"

"اگر مطالبہ پورا کر دیا گیا تو یقین رکھو، ان چاروں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"اور کیا تم یہ بتانا پسند نہیں کرو گے کہ ہو کون؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

"یہ بات جان کر بھی تم کچھ نہیں کر سکتے۔ صورتِ حال اس وقت پوری طرح ہمارے کنٹرول میں ہے۔"

"اچھا خیر، میں مانے لیتا ہوں کہ تم حالات پر پوری طرح کنٹرول رکھتے ہو اور من مانی کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ جب تمہارا بتانے کا وقت ہو جائے، بتا دینا۔ ہم ایک طرف بیٹھ رہے ہیں۔" انہوں نے تنگ آ کر کہا اور کچھ فاصلے پر جا کر پتھریلی زمین پر بیٹھ گئے۔

"اب کیا ہوگا جمشید؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"وہی جو خدا کو منظور ہوگا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، ہم ان کے خلاف کوئی

قدم نہیں اٹھا سکتے، نہ کسی طرف سے مکان کے اندر پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں، نہ ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر کے ذریعے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ ہمارے اس وقت چار آدمی ان کے قبضے میں ہیں اور جونہی ہم نے کوئی کارروائی کی، وہ انہیں جان سے مار دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

عین اسی وقت بے شمار گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے بوکھلا کر سڑک کی طرف دیکھا تو جیپوں کی ایک فوج آتی دکھائی دی۔

"شاید وادی کی پولیس کو حالات کا علم ہو گیا ہے، لیکن یہ لوگ بھلا کیا کر سکیں گے۔ کہیں الجھن نہ پیدا کر دیں۔ انہیں اطلاع نہیں دینا چاہیے تھی۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"آپ میں انسپکٹر جمشید موجود ہیں۔ وہ پہلی جیپ کے پاس تشریف لے آئیں۔" جیپوں کی طرف سے لاؤڈ سپیکر میں کہا گیا۔

وہ اٹھ کر ان کی طرف بڑھے۔ باقی لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ پہلی جیپ سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نیچے اترے اور انسپکٹر جمشید سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے:

"دارالحکومت سے آئی جی صاحب کا فون موصول ہوا ہے۔ انہوں نے سارے حالات بتانے کے بعد آپ سے ہر ممکن تعاون کرنے کی ہدایات دی ہیں۔ اب آپ جو کچھ بھی فرمائیں، ہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"افسوس، ہم کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، جو کچھ بھی کرنا ہے، مجرموں کو کرنا ہے۔ آپ اس مکان کو دیکھ ہی رہے ہیں۔ اس کی چھت کے چاروں طرف دشمن رائفلیں لیے بیٹھا ہے اور ہمارے چار آدمی انہوں نے یرغمال بنا رکھے ہیں۔"

"انتہائی خوف ناک، اب کیا ہوگا؟" ڈی ایس پی بولے۔

"ابھی تک انہوں نے اپنا مطالبہ نہیں بتایا۔ جونہی....."

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت پہاڑی مکان کی طرف سے آواز آئی تھی:

"انسپکٹر جمشید پلیز، مطالبہ بتانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نزدیک چلے آیئے۔"

"خدا کا شکر ہے کچھ تو ہوا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے، پھر رک کر ڈی ایس پی سے بولے۔

"آپ اس پہاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیں، لیکن جب تک میں نہ کہوں، کوئی قدم ہرگز نہ اٹھائیں۔ یہ چار انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔"

"اچھی بات ہے۔"

انسپکٹر جمشید مکان کی طرف چلے۔ ان کے ساتھیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اسی وقت مکان پر سے پھر آواز آئی

"انسپکٹر جمشید، ہم دیکھ رہے ہیں۔ پولیس پہاڑی کو گھیرے میں لینے کی تیاری کر رہی ہے۔ اگرچہ اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، پھر بھی میں حکم دیتا ہوں کہ پولیس سڑک سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔"

"اچھی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور ڈی ایس پی صاحب کو رکنے کا اشارا کرنے کے بعد پھر آگے بڑھے۔ جب سرخ کار کے نزدیک پہنچ گئے تو اچانک ان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ پریشانی کے عالم میں وہ ابھی تک سرخ کار کی طرف کوئی توجہ نہیں دے سکے تھے۔ انہوں نے محمود کے کان میں کہا:

"محمود، اس کار کے نمبر ڈی ایس پی کو بتا دو اور کہو کہ فوراً پتا لگائیں، یہ کار کس کی ہے؟"

"جی اچھا۔" اس نے بھی سرگوشی کی اور ڈی ایس پی صاحب کی طرف چلا گیا۔

"میں نزدیک آ گیا ہوں۔ اب بتایئے، آپ کا مطالبہ کیا ہے۔"

"سنیے جناب مشہور و معروف انسپکٹر صاحب، سنا ہے، آپ نے بڑے بڑے مجرموں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ آج شاید آپ کے لوہے کے چنے چبانے کی باری ہے۔ اپنے ڈی آئی جی صاحب کو فون کریں اور ان سے کہیں، انہیں سنہری جلدی والی نوٹ بک ۱۱ر جنوری کو ان کے ایجنٹ نے بھیجی ہے اور جسے پڑھنے میں ابھی تک کامیابی نہیں ہو سکی، وہ فوراً یہاں بھیج دیں۔ اس کے لیے خصوصی طیارہ اڑا کر لائیں یا ہیلی کاپٹر۔ جتنی دیر لگائیں گے، اتنا ہی آپ کے آدمیوں کا خون خشک ہو گا۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کیا تم لوگ عقل سے اتنے ہی پیدل ہو، ہم اس ڈائری کی تحریر کو فوٹو اسٹیٹ لے کر تم لوگوں کو واپس کر دیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"میرے عقل مند انسپکٹر، یہ ممکن نہیں ہے۔ اس نوٹ بک میں نظر نہ آنے الی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ ابھی تک تم لوگ جان ہی نہیں سکے کہ اس میں کیا کچھ حریر ہے، تاہم یہ ناممکن نہیں۔ مختلف تجرباتی ادوار سے گزر کر تم لوگ اس کی تحریر پڑھنے کے قابل ہو جاؤ گے اور یہ چیز میرے ملک کے حق میں انتہائی خوف ناک ہو گی، لہٰذا ں نے اس نوٹ بک کو واپس حاصل کرنے کا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔ یہ ھی بتا دوں، ہمارا صرف یہی ایک مطالبہ نہیں ہے۔ یہ تو مطالبے کی پہلی قسط ہے، کیسی ہی؟"

"اچھی رہی۔ میں ابھی ڈی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ مڑے اور جیپوں کی طرف چل پڑے۔ باقیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ سب لوگ دم بخود تھے۔ ایسے میں محمود بولا:

''ابا جان، کیا آپ کو اس نوٹ بک کے بارے میں معلوم ہے۔''

''ہاں، تین ماہ پہلے وہ نوٹ بک دشمن ملک میں موجود ہمارے ایک ایجنٹ نے بھیجی تھی اور اب وہ پروفیسر صاحب کے پاس ہے، لیکن یہ بھی ابھی تک اس کی تحریر پڑھنے میں یا دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔''

''اوہ، تو اب وہ نوٹ بک واپس کرنا ہوگی۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو افسرانِ بالا کی مرضی کی بات ہے۔'' انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

نزدیک پہنچ کر انہوں نے ڈی ایس پی صاحب کو مجرموں کے مطالبے کے بارے میں بتایا۔ وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے، پھر بولے:

''اب کیا ہوگا؟''

''وائرلیس پر ڈی آئی جی صاحب سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ فوری انتظام کریں۔''

''اچھی بات ہے۔'' انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹا بعد وہ وائرلیس پر ڈی آئی جی صاحب سے بات کر رہے تھے۔

''ہیلو سر، حالات کا آپ کو علم ہی ہے۔ مجرم سنہری جلد والی وہ نوٹ بک مانگتے ہیں جو اس وقت پروفیسر صاحب کے پاس موجود ہے۔''

''اوہ۔'' وہ دھک سے رہ گئے۔

''اب آپ کا جو حکم ہو، وہ کیا جائے۔''

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نوٹ بک میں کوئی خوف ناک قسم کا راز پوشیدہ

ہے، تبھی تو دشمن ملک نے اس کے حصول کے لیے اتنا لمبا چوڑا منصوبہ بنایا ہے، چونکہ یہ ایک قومی اور ملکی معاملہ ہے، لہٰذا میں آئی جی صاحب کے علم میں تمام باتیں لانا چاہتا ہوں، پھر جو انہوں نے حکم دیا، وہ کیا جائے گا۔ شیخ صاحب بھی یہیں موجود ہیں۔ اب وہ تم سے بات کریں گے۔''

''ہیلو جمشید، میں نے تمام حالت کا جائزہ لیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خان صاحب کی بیٹی عامرہ، تمہاری اور خان رحمان کی بیگمات اور ملازم اس مکان میں قید ہیں اور پستول ان کی کن پٹیوں پر رکھے ہیں۔ حالات اس سے زیادہ بھلا کیا خوف ناک ہوں گے، لیکن افسوس، چونکہ یہ معاملہ ملکی اور قومی ہے، اس لیے میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس کے لیے وزیرِ خارجہ یا پھر صدر صاحب سے اجازت لینا ہوگی۔ الجھن یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ نوٹ بک میں ہے کیا۔ خیر میں ان سے رابطہ قائم کرتا ہوں، تم انتظار کرو۔''

''جی بہتر۔'' انہوں نے کہا اور سلسلہ کٹ گیا۔

''ابا جان، اگر وزیرِ خارجہ یا صدر صاحب نے نوٹ بک ان کے حوالے کرنے کی اجازت نہ دی تو کیا ہوگا۔'' فرزانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس کے سوا کیا ہوگا کہ یہ لوگ ہمارے چاروں افراد کو گولیاں مار دیں گے اور ہم انہیں ختم کر دیں گے۔'' انہوں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''اف خدا، کیا ایسا بھی ممکن ہے۔''

''اگر اجازت نہ ملی تو۔ اس کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ دشمنوں کا یہ منصوبہ ایسا ہے کہ یا تو وہ کامیاب ہو جائیں گے یا ہم اپنے آدمیوں سے ہاتھ دھو لیں گے اور ساتھ میں دشمن ختم ہو جائیں گے، گویا ہم ہر طرح گھاٹے میں ہی رہیں گے۔'' وہ بولے۔

"لیکن اگر نوٹ بک ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا؟" محمود نے
بے تابانہ لہجے میں کہا۔

"اس صورت میں بھی ہمارے ساتھیوں کی واپسی آسان نہیں ہوگی۔ یہ
لوگ انہیں یرغمال بنا کر بھی یہاں سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں کیا
ہوگا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"یا اللہ رحم، ہم اسے کس قدر سیدھا سادا کیس سمجھتے تھے۔ یہ تو خوف ناک
ترین معاملہ نکل آیا۔ عامرہ، امی جان، آنٹی اور ظہور کا کیا حال ہوگا۔" فرزانہ بولی۔

"ظاہر ہے، پتا ہی ہوگا، لیکن ہم مجبور ہیں۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے
خان رحمان اور ان کے بچوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ خان
رحمان کسی قدر سنبھلے ہوئے نظر آئے۔

"خان رحمان، مجھے افسوس ہے، تم پر یہ بُرا وقت میری وجہ سے آیا۔"

"نہیں دوست، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ قسمت کا لکھا ہو کر رہتا
ہے۔" وہ بولے۔

اور پھر موت کی خاموشی چھا گئی۔ ان کے دماغ بھائیں بھائیں کرنے
لگے۔ آخر آئی جی صاحب کا پیغام پھر موصول ہوا:

"ہیلو جمشید، صدر صاحب سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے اجازت دے
دی ہے کہ نوٹ بک دشمنوں کے حوالے کر دی جائے۔ ایک ہیلی کاپٹر لے کر پروفیسر
صاحب یہاں آ جائیں اور تجربہ گاہ سے نوٹ بک لے کر وہاں پہنچ جائیں۔"

"بہت بہتر جناب۔ ایسا ہی کیا جائے گا۔" انہوں نے کہا، لیکن فکر کے
بادل اب بھی ان کے چہرے پر موجود تھے۔ وہ پروفیسر صاحب کی طرف مڑے:

"اس کیس میں اب آپ کا کام شروع ہوتا ہے۔ جائیے اور نوٹ بک

لے آئیے۔"

"اچھا۔" یہ کہہ کر وہ ڈی ایس پی صاحب کی طرف مڑے:

"چلیے جناب، ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیجیے۔"

"وہ بالکل تیار ہے۔ ہم ہر طرح تیاری مکمل کیے ہوئے ہیں۔" انہوں نے
کہا۔

"بہت خوب۔"

پروفیسر صاحب چلے گئے اور وہ انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ڈی ایس
پی صاحب واپس آ گئے اور انہوں نے بتایا۔

"پروفیسر صاحب چلے گئے ہیں۔ اب آپ ان لوگوں کو بتا دیں۔"

"اچھی بات ہے۔ سرخ کار کے بارے میں کچھ معلوم ہوا یا نہیں؟"

"اوہ ہاں، یہ چوری کی کار ہے، ایک سرکاری آفیسر اجمل راجپوت کی تین
چار دن سے گم ہے۔ انہوں نے چوری کی رپورٹ بھی درج کرا رکھی ہے۔"

"ہوں، گویا تین چار دن سے یہ مجرموں کے استعمال میں ہے۔ تب وہ
دارالحکومت سے عامرہ کو اغوا کر کے بھی اسی کار پر لائے ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید
بولے۔ پھر سرخ کار کے نزدیک پہنچے۔

"ہیلو، انسپکٹر جمشید آپ لوگوں سے مخاطب ہے۔ نوٹ بک آپ لوگوں
کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہمارے ساتھی نوٹ بک لینے کے لیے
دارالحکومت جا چکے ہیں۔ چند گھنٹوں بعد نوٹ بک یہاں موجود ہوگی۔ اس کے بعد کا
پروگرام بھی بتا دیں، تاکہ ابھی تیاری کر لی جائے۔"

"ہمارے لیے بھی ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کر لیا جائے۔ ہیلی کاپٹر اس
مکان کے عین اوپر آ کر ہوا میں رک جائے گا اور اس کی سیڑھی لٹکا دی جائے گی۔ میں

ہیلی کاپٹر اڑانا جانتا ہوں، لہٰذا آپ کے پائلٹ کو اتار دیا جائے گا۔ آپ کے چاروں ساتھیوں کو لے کر نوٹ بک سمیت ہم یہاں سے پرواز کر جائیں گے۔ جب نوٹ بک بحفاظت ہمارے ملک پہنچ جائے گی تو آپ کے ساتھیوں کو واپس بھیج دیا جائے گا۔ آپ کا پائلٹ اس مکان کی چھت پر اُترے گا۔ اترتے ہی ہاتھ اوپر اٹھا دے گا۔ ہم اس کی تلاشی لیں گے اور اسے نیچے بھیج دیں گے۔'' یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

''نیت ٹھیک نہیں لگتی دوست۔'' انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''آپ نے کہا ہے کہ نوٹ بک آپ کے ملک پہنچ گئی تو آپ ہمارے ساتھیوں کو واپس بھیج دیں گے، لیکن کیسے واپس بھیج دیں گے، پائلٹ تو آپ یہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس کا مطلب ہے ان لوگوں کو واپس بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں انہیں واپس بھیجنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ اپنے ملک سے ہم انہیں ایک غیر جانبدار ملک میں بھیج دیں گے۔ وہاں سے انہیں کسی پرواز کے ذریعے یہاں روانہ کر دیا جائے گا۔''

''ہوں، لیکن آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہمارے پائلٹ کو ساتھ لے جائیں۔ اپنے ملک میں آپ لوگ اتر جائیں۔ پائلٹ فضا میں سے ہی واپس لوٹ آئے گا۔''

''نہیں، ہم ہر کام اپنے منصوبے کے مطابق کریں گے۔ منصوبے کی ذرا سی تفصیل بھی پہلے سے طے ہے اور اس سے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوا جائے گا۔''

''اچھا دوست جیسے تمہاری مرضی، ایک بات کہے دیتا ہوں۔ اگر ہمارے

آدمی بحفاظت تمام واپس نہ پہنچے تو انسپکٹر جمشید موت بن کر تمہارے سروں پر ضرور نمودار ہوگا۔ تم اور تمہارا ملک اسے روک نہیں سکے گا۔''

''اوہو، یہ دم خم ہیں، تو پھر ایسا کیوں نہ کریں کہ ہم تمہارا چیلنج منظور کر لیں۔'' دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

''لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ منصوبے کی ذرا ذرا سی تفصیل بھی پہلے سے طے ہے، پھر یہ تبدیلی کس طرح کی جائے گی۔'' انسپکٹر جمشید کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

''اوہ سوری، ویسے ہی ایک بات منہ سے نکل گئی۔ بے فکر رہو، کل تک تمہارے آدمی دارالحکومت پہنچ جائیں گے، یہ میرا وعدہ ہے۔''

''میرا اسے کیا مراد ہے، ہم کیا جانیں، آپ کون ہیں؟''

''پرواز کرتے وقت میں اپنا نام ضرور بتاؤں گا، بے فکر رہو۔''

''ایک بات میں بھی کہوں گا، یہ منصوبہ بے شک بہت ذہانت سے ترتیب دیا گیا ہے، لیکن ہے بزدلانہ منصوبہ۔'' انسپکٹر جمشید جلے کٹے لہجے میں بولے۔

''ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ بزدلانہ ہے یا عقلمندانہ۔ ہمیں تو غرض اس سے ہے کہ یہ مکمل طور پر کامیاب ہوتا ہے یا نہیں اور حالات پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ کامیاب ہوگا۔''

''اچھا، اب ذرا ہم سڑک کی طرف جا کر معلوم کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کہاں پہنچ چکے ہیں۔''

''ضرور معلوم کرو۔'' اس نے گویا ہنس کر کہا۔

مکان کے پاس سے ہٹتے ہوئے محمود نے کہا:

''ابا جان، اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔''

''کیا مطلب، تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں کسی نہ کسی طرح مکان میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔''

''دماغ تو نہیں چل گیا، یا پھر سلیمانی ٹوپی ہاتھ لگ گئی ہے۔'' فرزانہ جل کر بولی۔

''میرا جی چاہتا ہے، مکان کے اندر پہنچ جاؤں اور ان سے ٹکرا جاؤں۔'' وہ بولا۔

بھئی پرسکون رہو، ہم سب کا جی چاہ رہا ہے، لیکن یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اگر پروفیسر صاحب کی واپسی میں رات ہو گئی تو شاید ہم کچھ کر سکیں، کیونکہ آج چاند کی پہلی تاریخ ہے، یہاں مکمل طور پر تاریکی ہو گی۔''

''تو کیا انہوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہو گا۔'' فرزانہ بولی۔

''ایسا نظر تو نہیں آتا۔ منصوبہ کسی بہت ہی ذہین آدمی کا بنایا ہوا ہے۔ اس نے کالسباوادی سے دارالحکومت کا فاصلہ ضرور ذہن میں رکھا ہو گا اور یہ اندازہ بھی ضرور ذہن میں رکھا ہو گا کہ نوٹ بک لاتے لاتے رات ہو سکتی ہے اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ہم لوگ مکان تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''گویا انہوں نے اس کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا ہو گا۔'' فاروق نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، میرا تو یہی خیال ہے، تاہم یہ ناممکن بھی نہیں کہ انہوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہو۔''

''خیر، دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔'' محمود بڑبڑایا۔

''ہیلو ایس پی صاحب، سنائیے، پروفیسر صاحب کہاں تک پہنچے۔'' انسپکٹر جمشید سڑک کے نزدیک پہنچتے ہوئے بولے۔

''جی بس دارالحکومت تک پہنچنے ہی والے ہیں۔''

''اوہ، اس کا مطلب ہے، وہ ایک گھنٹے تک لوٹ آئیں گے۔''

''جی ہاں، اندازہ تو یہی ہے۔''

''کاش، وہ کچھ دیر لگا دیں۔''

''کیوں، دیر لگانے کا کیا فائدہ ہو گا؟'' انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

''رات کی تاریکی پھیل جائے گی اور شاید ہمیں کوئی کام دکھانے کا موقع مل جائے۔''

''اوہ، تب تو پروفیسر صاحب کو یہ پیغام دیا جا سکتا ہے۔''

''نہیں، میں ایسی کوئی کوشش نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں پروفیسر صاحب اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر کچھ دیر لگا دیں تو اور بات ہے۔''

''مجھے تو حیرت یہ ہے کہ اس نوٹ بک میں ہے کیا؟''

''کاش ہمیں معلوم ہوتا، ہمارے جس ایجنٹ نے وہ بھیجی، اسے خود بھی نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے۔ بس اس کا کہنا یہ ہے کہ اس نوٹ بک کی حفاظت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اسے اڑانے کی کوشش کی۔ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ دشمن اسے حاصل کرنے کے لیے اتنا بڑا منصوبہ بنا کر آئے گا، تو پورے ملک کے ماہرین اس نوٹ بک کا راز معلوم کرنے کی کوشش میں لگ جاتے، لیکن ہم نے تو اسے سرسری انداز میں پروفیسر داؤد کے حوالے کر دیا تھا اور انہوں نے بھی ضرورت سے زیادہ اہمیت اسے نہیں دی ہو گی۔''

''بالکل یہی بات ہے، ورنہ پروفیسر انکل اس کی تحریر پڑھنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔''

''اس معاملے میں بے بسی کا جو عالم ہے، وہ شاید ہی کبھی محسوس ہوا ہو گا۔''

فرزانہ نے تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خود پر قابو رکھو، جوش اور غصے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس وقت تک تاریکی پھیل چکی تھی، لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوئی مکان کی طرف بڑھنے کی جرأت کر سکتا۔ جوں ہی ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی، مکان کی چھت پر چار سرچ لائیٹیں جل اٹھیں اور چاروں طرف روشنی پھینکنے لگیں۔ سرچ لائٹوں کا رخ نیچے تھا اور اس روشنی میں کسی کا نظر آئے بغیر مکان کی طرف بڑھنا تقریباً ناممکن نظر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید بول اٹھے:

"دیکھا، میں نے کہا تھا نا، انہوں نے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔"

ہیلی کاپٹر نیچے اترنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کے قریب ٹک گیا۔ پھر اس کا دروازہ کھلا اور پروفیسر داؤد باہر نکلے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا:

"میں نوٹ بک لے آیا ہوں جمشید۔"

"لائیے نوٹ بک مجھے دیں۔" وہ بولے۔

پروفیسر صاحب نے نوٹ بک جیب سے نکال کر ان کے حوالے کر دی۔ اب وہ مکان کی طرف بڑھے۔

"ہیلو، نوٹ بک آ گئی ہے۔ اب کیا کیا جائے؟"

"پہلے میں یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی دھوکا تو نہیں کیا جا رہا۔ یہ وہی نوٹ بک ہے یا کوئی اور۔ اس لیے تم میں سے ایک نوٹ بک لے کر مکان کے دروازے تک آئے گا۔ میں نوٹ بک اس سے لے کر اسے واپس جانے دوں گا۔ اس کے بعد آپ ہمارے لیے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کریں گے۔"

"بہت بہتر، تو میں نوٹ بک بھیج رہا ہوں، میں خود نہیں آ رہا۔ کہیں تم یہ خیال نہ کر بیٹھو کہ ہم کوئی چال چلنے کی سوچ رہے ہیں۔"

"تم سوچو تو بھی کیا ہے۔ بڑی خوشی سے تم خود نوٹ بک لے کر آ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" دوسری طرف سے کہا تھا۔

"نہیں، میں اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں، تمہارے بچے کن خوبیوں کے مالک ہیں، لیکن اس جگہ کوئی خوبی آزمانے کا انجام صرف اور صرف تمہارے آدمیوں کی موت ہوگا۔ جو کرنا ہے، سوچ سمجھ کر کرنا۔ جوں ہی میرے آدمیوں نے کوئی گڑبڑ محسوس کی، وہ انہیں گولی مار دیں گے۔"

"اچھا محمود، یہ نوٹ بک اوپر دے آؤ۔"

محمود نے نوٹ بک لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جھانکا، جیسے پوچھنا چاہتا ہو، کیا میں واقعی نوٹ بک دے آؤں اور کوئی کام دکھانے کی کوشش نہ کروں، لیکن ان کی آنکھوں سے وہ کوئی اشارا نہ کیچ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ محمود کو اپنی مرضی پر چھوڑ دینا چاہتے ہوں۔

آخر محمود نے نوٹ بک لی۔ ایڑیوں پر گھوما اور پتھریلے زینے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس لمحے ان کے دل دھکڑ دھکڑ کرنے لگے۔ اس پورے معاملے میں یہ پہلا موقع انہیں ملا تھا۔ جب وہ کوئی کام دکھا سکتے تھے، اسی لیے انسپکٹر جمشید نے محمود کو نوٹ بک دے کر بھیجا تھا۔ وہ خود لے کر جاتے تو دشمن ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہو جاتا۔ محمود کو آتے دیکھ کر شاید ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی۔

ادھر محمود کا ذہن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ اس لمحے کچھ نہ کر سکا تو دشمن اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیابی حاصل کر لیں گے، لیکن

سوال تو یہ تھا اور بہت فکر میں مبتلا کر دینے والا سوال تھا کہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اگر اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کا معاملہ ہوتا تو وہ ذرا بھی نہ چوکتا، لیکن اس وقت چار آدمی دشمن کی زد میں تھے۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دفعتاً اسے اپنے چاقو کا خیال آ گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چاقو کا خیال تو اسے بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا، کیونکہ وہ ایک ایسا ہتھیار تھا، جسے ہاتھ میں بخوبی چھپایا جا سکتا تھا۔ نوٹ بک اس کے بائیں ہاتھ میں تھی اور چاقو دائیں جوتے میں۔ اب جو اس نے دایاں پاؤں اوپر اٹھایا، ہاتھ ایڑی سے ٹکرایا اور دوسرے لمحے چاقو اس کے ہاتھ میں تھا، ساتھ ہی اس نے اس کی کمانی دبا دی۔ ننھا چاقو آواز پیدا کیے بغیر کھل گیا اور اب یہ اس کی ہتھیلی میں تھا۔ وہ یہ بات محسوس کر سکتا تھا کہ اوپر موجود دشمن بھی کچھ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ محمود یہ کام کر تو گزرا، لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا، وہ چاقو سے کچھ کام بھی لے سکے گا یا نہیں۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر قدم رکھا۔ دروازہ کھولے کوئی کھڑا تھا اور اس کا ہاتھ نوٹ بک تھامنے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا۔ محمود کے پاس وقت بہت کم تھا۔ جو کچھ کرنا تھا، ایک سیکنڈ کے اندر اندر کرنا تھا۔ دروازے میں سے اس کی نظریں اندرونی کمرے میں گئیں اور پھر اچانک اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا، لیکن اس میں سے پہلے بایاں ہاتھ آگے بڑھا تھا، جس میں نوٹ بک تھی۔ دروازے میں کھڑے شخص کو نوٹ بک پکڑنے کے لیے ہاتھ اور آگے بڑھانا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے چاقو اس کے سینے میں اتر گیا۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ ساتھ ہی محمود نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ سیڑھیوں پر لڑھکتا نیچے کی طرف چلا۔ یہ سب کچھ صرف ایک سیکنڈ کے اندر ہو گیا۔ فوراً محمود کمرے کے اندر تھا۔ اس کمرے میں کوئی نہیں تھا، یہی دیکھ کر اس نے یہ کام کیا تھا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ بند نظر آیا۔ ابھی وہ ادھر کا رخ کر ہی رہا تھا کہ لکڑی کی

سیڑھی پر کسی کے اترنے کی آواز سنی، گویا اوپر خطرہ محسوس کر لیا گیا تھا اور صورت حال جاننے کے لیے کوئی نیچے آ رہا تھا۔ محمود کو اور تو کچھ نہ سوجھا، سیڑھی کے نچلے سرے پکڑ کر اسے گھسیٹ لیا۔ سیڑھی بلند آواز سے نیچے گری۔ ساتھ ہی ایک آدمی بھی نیچے گرا۔ محمود نے اسے بھی موقع دینا مناسب نہ سمجھا اور چاقو اس کے دل میں اتار دیا۔ اس کی لرزہ خیز چیخ نے فضا کو تھرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی چھت پر سے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ گولیاں محمود کے دائیں بائیں لگیں اور وہ لوٹ لگا گیا۔ اس کا رخ دوسرے کمرے کی طرف تھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ اندھا دھند اندر داخل ہو گیا۔ ساتھ ہی وہ تیزی سے مڑا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پہلا کمرہ اندر سے خالی دیکھ کر اس کے دماغ میں بجلی سی کوندی گئی تھی اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب تک جو کچھ بتایا جاتا رہا ہے، وہ درست نہیں ہے، اگر ان لوگوں نے ان کے چاروں ساتھیوں کی کن پٹیوں پر پستول رکھے ہوئے تھے تو وہ پہلے کمرے میں ہی موجود ہونے چاہئیں تھے، تاکہ نوٹ بک دینے کے لیے آنے والا اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ لیتا، لیکن ایسا نہیں تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کمرے میں بیگم جمشید، بیگم خان رحمان، ظہور اور عامرہ رسیوں سے بری طرح جکڑے پڑے تھے۔ ان کے منہ بھی بری طرح باندھ دیے گئے تھے۔ اندر ضرور رومال ٹھونسے گئے ہوں گے۔ باہر اب تڑا تڑ گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر دھم کی آواز سنائی دی، شاید کسی نے چھت سے بیرونی کمرے پر چھلانگ لگائی تھی اور پھر دروازے پر ٹکریں ماری جانے لگیں۔ اسی وقت اس نے اپنے والد کی آواز سُنی:

"معرکہ شروع ہو گیا ہے۔ مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔"

محمود نے جلدی جلدی ان کی رسیاں کاٹ دیں اور پھر سب دروازے پر

زور لگانے لگے۔ وہ باہر کی طرف زور لگا رہے تھے اور باہر سے برابر ٹکریں ماری جا رہی تھیں۔ دشمنوں کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دروازہ ٹوٹ جائے اور وہ اندر داخل ہو کر محمود سے نوٹ بک چھین لیں۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی صورت بھی دروازہ نہ ٹوٹنے پائے۔ اچانک محمود کو نوٹ بک کا خیال آیا اور وہ دھک سے رہ گیا۔

نوٹ بک تو اس کے ہاتھ میں تھی ہی نہیں۔ وہ شاید اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، جب اس نے سیڑھی کھینچی تھی۔

☆☆☆

وہ مارا

محمود کو رخصت کرتے وقت انسپکٹر جمشید نے کوئی اشارا نہیں دیا تھا۔ اشارا دیتے بھی کیا، ان کی تو جانیں دشمنوں کی مٹھیوں میں تھیں، ان حالات میں کیا ہی کیا جا سکتا ہے، تاہم نوٹ بک پہنچانے کا کام محمود کو اس لیے سونپا تھا کہ وہ موقع محل دیکھ کر بجلی کی طرح حرکت میں آ جانے کا عادی تھا اور اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ چاروں طرف سرچ لائٹوں کی وجہ سے وہ دروازے کو پوری طرح نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ اس لیے محمود نے وہاں کیا کیا، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا، نہ ہی انہوں نے سیڑھیوں پر کسی کو گرتے دیکھا۔ پتھریلی سیڑھیوں پر گرنے کی آواز بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہاں گھٹی گھٹی چیخ ضرور ان کے کانوں میں آ گئی تھی، لیکن وہ اس وقت بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ صورت حال کا علم بھی نہیں تھا، لیکن پھر جب سیڑھی گرنے کی آواز سنائی دی اور اوپر سے مکان کے اندر فائر کیا گیا تو وہ جان گئے کہ محمود حرکت میں آ گیا ہے لہٰذا انہوں نے چلا کر کہا:

"معرکہ شروع ہو گیا ہے، مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔"

ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی چھت پر سے ان کی طرف فائرنگ شروع کر دی گئی۔ انہوں نے آناً فاناً لیٹ کر پوزیشن لے لی، پولیس حرکت میں آ گئی۔ مناسب فاصلے پر رہتے ہوئے پہاڑی کو گھیرے میں لیا جانے لگا۔ ساتھ ساتھ گولیوں

کا تبادلہ ہو ہی رہا تھا۔ ایسے میں انہوں نے فاروق اور فرزانہ سے کہا:

"محمود کو ضرور ہماری مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں مکان کی طرف جاتا ہوں۔ تم لوگ یہیں ٹھہر کر جوابی فائرنگ کرتے رہو۔"

"جوابی فائرنگ کرنے والے تو بہت ہیں ابا جان، ہمیں بھی اپ کے ساتھ چلنا چاہیے۔"

"لیکن مکان تک پہنچنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ چاروں طرف مسلسل گولیاں برسا رہے ہیں۔ ہمیں گولیوں کی اس بارش سے بچ کر نکلنا ہوگا، لہٰذا خطرہ کیوں مول لیا جائے، صرف میں جاؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

"خیر، پہلے آپ چلے جایئے۔ اگر کوئی سمت کمزور نظر آئی کہ ہم بھی اسی سمت سے آنے کی کوشش کریں گے۔"

"خیر یونہی سہی۔" انہوں نے کہا اور چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو گئے۔ گولیاں مشین گنوں سے برسائی جا رہی تھیں، اس لیے سلسلہ رک ہی نہیں رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو جمشید، موت کو دعوت نہ دو۔"

"موت کو دعوت تو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ پہلے سے یہ دعوت دشمنوں کی طرف سے دی گئی تھی، پھر محمود نے دے ڈالی۔ اب اگر میں نے دعوت نہ دی تو موت کیا خیال کرے گی۔" انہوں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"موت کیا خیال کرے گی۔" خان رحمان حیران ہو کر بولے اور ساتھ ہی انہوں نے چھلانگ لگا دی۔

"ٹھیک تو ہے انکل، موت کو بھی تو کچھ خیال کرنا ہی چاہیے۔ خیال کرنے کے لیے بس ہم ہی تو نہیں رہ گئے۔" فاروق مسکرایا۔

انہوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید نے بہت لمبی چھلانگ لگائی تھی اور پھر گرتے

ہی لڑھکتے چلے گئے تھے۔ ان کا لڑھکنا اس وقت تک بند نہ ہوا۔ جب تک کہ وہ پہاڑی کے دامن میں نہیں پہنچ گئے۔ اب وہ برستی گولیوں سے محفوظ تھے۔ انہوں نے فوراً سیڑھیوں کا رخ کیا۔

"لو بھئی فاروق، ابا جان تو میدان مار گئے اور پہنچ گئے محمود کی مدد کے لیے، رہ گئے ہم نکمے، لیکن میں زیادہ دیر تک نکمے پن کے احساس کو برداشت نہیں کر سکتی، لہٰذا میں چلی۔"

"ارے ارے، دیکھو تو، گولیوں کے وقفے کا تو حساب لگا لو۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"حساب تم لگا لو اور جواب مجھے بتا دینا، میں چلی۔" یہ کہہ کر چھلانگ لگا دی۔ اس نے بھی بالکل وہی طریقہ اختیار کیا جو انسپکٹر جمشید نے کیا تھا۔

"انکل، کیا میں بالکل نکما اور گیا گزرا ہوں۔" فاروق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"پپ، پتا نہیں بھائی، میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔" خان رحمان ہکلائے۔

"نہیں انکل، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نکما اور گیا گزرا ہوں۔" فاروق نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"دیکھیے نا انکل، ابا جان اور فرزانہ محمود کی مدد کو پہنچ گئے۔ اور میں یہاں کھڑا باتیں بگھار رہا ہوں، حالانکہ اب تو عورتوں نے دال تک بگھارنا چھوڑ دی ہے۔ لیجیے، یہ دال کا برستی گولیوں میں کہاں سے ذکر نکل آیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہاں تو انکل، اس نکمے پن کے تکلیف وہ احساس سے تو موت بہتر ہے، لہٰذا میں بھی گیا ہے۔"

"ارے ارے۔" خان رحمان بوکھلا اٹھے۔

اور فاروق نے دوڑ لگا دی۔ وہ کچھ اس طرح لہراتا ہوا نکلا کہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

”خان رحمان، کمال کے پھرتیلے ہیں یہ لوگ۔ کاش میں بھی۔“ پروفیسر داؤد کہتے کہتے رک گئے۔

”آپ رک کیوں گئے۔ کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں، یہی نا کہ کاش میں بھی اتنا ہی پھرتیلا ہوتا، لیکن پروفیسر صاحب، یہ بات جان لیں، اگر آپ اتنے پھرتیلے ہوتے تو پھر سائنس دان ہرگز نہ ہوتے اور ہاں، اب میں بھی نہیں رک سکتا۔ جمشید کیا خیال کرے گا۔“

”اچھا تو پھر جاؤ، تم بھی جاؤ، خدا حافظ۔ مجھے افسوس ہے، یہ کارنامہ میں نہیں دکھا سکوں گا۔“

”آپ کی یہاں ضرورت بھی ہے۔ بچوں کے پاس بھی تو کسی کو رہنا چاہیے۔“ انہوں نے کہا اور دوڑ لگا دی۔

☆☆

جوں ہی انسپکٹر جمشید نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر قدم رکھا۔ ایک گولی ان کے سر پر سے گزر گئی۔ وہ فوراً لیٹ گئے اور جس طرف سے گولی آئی تھی، ایک فائر اس طرف کر دیا۔ اگرچہ یہ فائر اندھا دھند کیا گیا تھا، پھر بھی جواب میں ایک چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ بیرونی کمرے سے آئی تھی۔ انہوں نے سر ابھار کر دیکھا تو دو آدمی دروازے پر ٹکریں مارتے دکھائی دیے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دو فائر کیے اور وہ دونوں الٹ کر پیچھے گرے۔ چند سیکنڈ تڑپے اور پھر بے حس ہو گئے۔ اب وہ اٹھے اور اندر پہنچے۔ بند دروازے پر ہاتھ سے دستک دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

”محمود، کیا تم اندر ہو؟“

”اور کہاں ہو سکتا ہوں ابا جان۔“ محمود چہک کر بولا۔ ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ اسی وقت اوپر سے کسی نے فائر کیا اور گولی انسپکٹر جمشید کی دائیں ٹانگ میں لگی۔ وہ فوراً کمرے کے اندر کی طرف گر گئے۔

”دروازہ بند کر لو، گولی میری ٹانگ میں لگ گئی ہے۔“

”اوہ۔“ محمود گھبرا گیا۔

دروازہ بند کرتے ہی اس نے پتلون اوپر چڑھائی تو پنڈلی سے خون بہتا نظر آیا۔ گولی گوشت کو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

”خدا کا شکر ہے، زخم معمولی ہے۔ جلدی سے رومال باندھ دو۔“

”جی اچھا۔“ محمود نے کہا اور رومال باندھنے لگا۔ اتنے میں باہر سے آواز آئی۔

”ابا جان، آپ کہاں ہیں، میں سیڑھیوں تک پہنچ گئی ہوں۔“

”وہیں ٹھہرنا فرزانہ، آگے خطرہ ہے۔ میں بھی زخمی ہو گیا ہوں۔“

”اوہ۔“ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ بوکھلا کر مڑی تو فاروق کو آتے دیکھا ڈی ایس پی صاحب حملہ شروع ہوتے ہی انہیں بھی ایک ایک پستول دے چکے تھے۔ اور اب ان کے پاس پستول موجود تھے۔

”تو تم بھی آ گئے۔“

”وہاں رہ کر کیا کرتا۔“ فاروق بولا۔

”ابا جان زخمی ہو گئے ہیں۔“

”اف اللہ، زخم زیادہ تو نہیں آیا؟“

”پتا نہیں، ہم آگے نہیں جا سکتے۔ گولی لگ جانے کا خطرہ ہے۔“

اسی وقت ایک بار پھر آہٹ سنائی دی۔

"اس مرتبہ ضرور انکل خان رحمان آ رہے ہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"ہاں فرزانہ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" خان رحمان بولے: "لیکن تم یہاں کیوں اٹک گئے ہو۔"

"آگے جانا خطرناک ہے۔ ابا جان زخمی ہو چکے ہیں۔"

"اوہ، تب..... تب تو میں رک نہیں سکتا۔"

"لیکن ابا جان کا حکم یہی ہے کہ ہم آگے نہ جائیں۔" فرزانہ بولی۔

"جمشید تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں، زخم بہت معمولی ہے۔ چھت پر سے کوئی کمرے کے اندر بھی فائرنگ کر رہا ہے۔ اس لیے تم لوگوں کا وہیں رکے رہنا مناسب ہے۔" یہ کہہ کر وہ محمود کی طرف مڑے:

"محمود، وہ نوٹ بک کہاں ہے؟"

"وہ شاید بیرونی کمرے میں سیڑھی کے آس پاس کہیں گر گئی تھی۔ وہیں پڑی ہوگی۔"

"فاروق، فرزانہ نوٹ بک سیڑھی کے آس پاس کہیں پڑی ہے۔ کیا تمہیں نظر آ رہی ہے۔"

"جی، جی نہیں۔" فاروق نے سیڑھی کے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ بیرونی کمرے میں بلب روشن تھا اور اس کی روشنی میں وہ بآسانی فرش کا جائزہ لے سکتے تھے۔

"کیا سیڑھیوں کے نیچے کوئی لاش پڑی دیکھی ہے آپ لوگوں نے۔" محمود پریشان ہو کر بولا۔

"نہیں تو، وہاں تو کوئی لاش نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب پھر، ضرور وہی نوٹ بک لے گیا ہے۔ وہ پھر اوپر چڑھ آیا ہوگا۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟ اس کی جو تم سے نوٹ بک لینے کے لیے دروازے پر موجود تھا؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"ہاں میں نے اس کے سینے میں چاقو اتار دیا تھا اور پھر ہاتھ پکڑ کر جھٹکا مارا تھا۔ وہ لڑھک گیا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ اسی وقت کوئی لکڑی کی سیڑھی پر سے نیچے آنے لگا میں نے سیڑھی کھینچ لی۔ بس اسی وقت نوٹ بک گر گئی۔ سیڑھی والا دھڑام سے نیچے گرا۔ میں نے اس پر بھی چاقو سے وار کیا۔ اس کی لاش تو سیڑھی کے پاس پڑی ہے نا؟"

"ہاں، وہ مر چکا ہے شاید۔ اور ہو سکتا ہے، نوٹ بک اس کے نیچے موجود ہو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"لیکن وہ سیڑھی سے دُور پڑا ہے، جب کہ نوٹ بک سیڑھی کے پاس ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب ہے، جسے میں نے نیچے دھکا دیا تھا، وہ زیادہ زخمی نہیں ہو سکا تھا، لہٰذا وہ پھر اوپر آیا اور نوٹ بک اٹھا کر پھر نیچے اتر گیا، ورنہ اس کی لاش سیڑھیوں کے نیچے ہونی چاہیے تھی۔"

"اوہ، ضرور یہی بات ہے، ٹھہرو۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا منہ باہر کی طرف کیا اور بولے:

"فاروق، فرزانہ اور خان رحمان، ایک زخمی دشمن نوٹ بک لے کر نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ نیچے اتر کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ ملے تو پھر خون کے دھبوں کے ذریعے اس سمت کا اندازہ لگاؤ۔ جس طرف وہ گیا ہے۔ وہ کسی قیمت پر بھی فرار نہ ہونے پائے، کیونکہ اس منصوبے کا سرغنہ وہی ہے، وہی ہم

سے بات کرتا رہا ہے۔"

"بہت بہتر ابا جان، ہم نیچے اتر رہے ہیں۔" فاروق بولا۔

"لیکن احتیاط سے، گولیاں ابھی تک اسی زور شور سے برس رہی ہیں۔"

"فکر نہ کریں ابا جان، ہم نیچے اُتر رہے ہیں۔" فرزانہ بولی اور پھر تینوں نیچے اترنے لگے۔ سیڑھیوں کے آس پاس واقعی کوئی لاش نہیں تھی، تاہم خون کے دھبے ضرور موجود تھے۔

"لیکن اندھیرے میں ہم خون کے دھبے کس طرح دیکھیں گے۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"فاروق کی جیب کس دن کام آئے گی۔"

"فاروق کی جیب، کیا مطلب؟" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"جی، مطلب یہ کہ یہ اپنی جیب میں دنیا جہان کی الابلا چیزیں بھرے رکھتا ہے۔ اس میں ضرور کوئی پنسل ٹارچ بھی ہوگی۔"

"بالکل ہوگی۔ کوئی تمہاری طرح نہیں، جس کی قمیص میں جیب نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔ خان رحمان مسکرانے لگے۔ فاروق نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر ہی چیزوں کو ٹٹولنے لگا۔ آخر خوش ہو کر بولا:

"یہ رہی، مل گئی۔ ارے، ہاتھ سے نکل گئی۔"

"وہ پنسل ٹارچ ہے یا کوئی چکنی مچھلی، جو ہاتھ سے نکل گئی۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"بس ابھی لو، اب نہیں نکلنے دوں گا۔" اس نے پھر کوشش شروع کر دی، آخر بولا:

"وہ مارا، یہ لو ٹارچ۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ باہر نکالا اور یہ دیکھ کر فرزانہ

بھنا اٹھی کہ اس کے ہاتھ میں ٹارچ کی بجائے مارکر تھا۔

"دیکھا انکل، یہ ہے اس کی جیب کا حال۔" وہ بولی۔

"اوہ، سوری انکل، اب میں ٹارچ نکال کر رہوں گا۔"

"بھئی، اس سے تو بہتر ہے، ہم بغیر ٹارچ کے دھبے دیکھنا شروع کر دیں۔" خان رحمان تلملا اٹھے۔

اور فاروق نے فوراً ٹارچ نکال لی۔

خدا کا شکر ہے، نوٹ بک سے پہلے ٹارچ کی تلاش کا مرحلہ تو طے ہوا۔" فرزانہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

اب تینوں نیچے اترے اور چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ خون کے دھبے جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک ایک گرج دار آواز سنائی دی:

"خبردار، یہ کون آرہا ہے؟"

"یہ ہم ہیں، انسپکٹر جمشید کے ساتھی، فائر نہ کریں۔"

"اپنے نام بتائیں۔"

"خان رحمان، فاروق اور فرزانہ۔"

"ٹھیک ہے، ہاتھ اوپر اٹھا کر چلے آئیں، کیونکہ یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ پولیس کے گھیرے کے قریب آ گئے۔ پولیس والوں نے انہیں پہچان لیا اور ان میں سے ایک بولا:

"آپ عمارت کی طرف سے آرہے ہیں۔"

"ہاں، ایک دشمن نوٹ بک لے کر فرار ہو گیا ہے، ہم اس کی تلاش میں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارے گھیرے کو کسی نے توڑنے کی کوشش کی

نہیں۔" پولیس آفسر بُرا مان کر بولا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ وہ دراصل گھیرا ڈالے جانے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔"

"تب پھر آپ لوگ اسے کس طرح پکڑ سکیں گے؟"

"وہ زخمی ہے، رفتار زیادہ نہیں ہوگی اس کی۔"

"اور سمت کا اندازہ کس طرح لگائیں گے؟"

"خون کے قطرات سے۔ ہمارے پاس ٹارچ موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

انہوں نے گھیرے سے نکل کر ٹارچ کی مدد سے خون کے دھبوں کی تلاش شروع کر دی۔ سمت کا اندازہ سیڑھیوں کے پاس سے ہی لگا چکے تھے۔ جلد ہی انہیں خون کے دھبے نظر آ گئے اور وہ ان کے سہارے جنگل میں بڑھنے لگے۔ رفتار بہت تیز رکھی، تا کہ دشمن دُور نہ نکل جائے۔ انہوں نے اپنے پستول ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ دشمن سے کسی وقت بھی سامنا ہو سکتا تھا۔ خون کے قطرات کا سلسلہ ان کی مدد کرتا رہا، اور وہ آسانی سے آگے بڑھتے رہے۔ کسی ایک جگہ بھی انہیں رکنا نہیں پڑا اور اس کا مطلب تھا، دشمن کافی زخمی تھا اور خون روکنے کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اچانک انہوں نے ایک جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ فرزانہ بوکھلا اُٹھی۔

"انکل، دشمن فرار ہونے والا ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے دوڑ لگا دی۔

خان رحمان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دُور بہت دُور انہیں جیپ کی سرخ روشنیاں نظر آئیں۔ انہوں نے رفتار اور تیز کر دی ادھر جیپ بھی چل چکی تھی۔

"انکل، وہ جیپ کو زیادہ تیز نہیں چلا سکتا۔ قدم قدم پر درخت موجود ہیں، لہٰذا ہم اسے پکڑ سکتے ہیں۔ اس کا پروگرام سرحد کی طرف جانے کا ہے۔ اسی جنگل کے کنارے پر سرحد موجود ہے اور دوسری طرف اس کے ساتھی ضرور اس کا انتظار کر رہے ہوں گے، کیونکہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، باقاعدہ منصوبے کے تحت ہو رہا ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے، آج اس قدر تیز دوڑیں کہ کبھی نہ دوڑے ہوں گے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو فرزانہ۔" خان رحمان بولے۔

اور وہ نہایت تیز رفتاری سے دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا۔ جب خان رحمان نے محسوس کیا کہ جیپ پستول کی گولی کی رینج میں آ گئی ہے تو انہوں نے دوڑتے دوڑتے اس پر فائر کر دیا، پھر فائر کر کے رکے نہیں۔ مسلسل فائر کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے جیپ کو ڈگمگاتے دیکھا۔

"وہ مارا۔" فاروق چلایا۔

☆☆☆

خطرہ آ کودا

"ان کے پاس نہ جانے کب اسلحہ ختم ہوگا۔ اس سے پہلے تو یہ ہار مانیں گے نہیں، کیوں نہ میں چھت پر جا کر ان کا سامان کروں۔" انسپکٹر جمشید نے مسلسل فائرنگ کی آوازیں سن کر کہا۔

"لیکن ابا جان، آپ زخمی ہیں۔ دوسرے یہ کہ لکڑی کی سیڑھی لگا کر اوپر جانا بالکل غیر محفوظ ہے۔ وہ اوپر سے فائر کر سکتے ہیں۔ آپ سیڑھی پر ہوتے ہوئے اپنا بچاؤ کس طرح کر سکیں گے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"پھر تم ہی بتاؤ، کیا کیا جائے؟" وہ بولے۔

"اب ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم نے اپنے ساتھیوں کو ان کے چنگل سے نکال لیا ہے۔ ایک پارٹی مفرور ملزم کی تلاش میں جا چکی ہے۔ جب ان کے پاس گولیاں ختم ہو جائیں گی تو یہ بھی ہتھیار ڈال دیں گے۔" محمود جلدی جلدی بولا۔

"لیکن اس طرح مجھے مزا نہیں آتا۔ میں چاہتا ہوں، ہم ان کا اسلحہ ختم ہونے کا انتظار نہ کریں، بس ان پر جا پڑیں۔"

"تو پھر مجھے اجازت دیں، میں چھت پر جا کر ان کا مقابلہ کروں گا۔"

"نہیں، تم اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"اور میں کہتی ہوں، آپ دونوں کو خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔"

عین اسی وقت چھت پر ایک چیخ گونجی۔ شاید کوئی دشمن نشانہ بن گیا تھا۔

"لیجیے، ایک اور کم ہوا۔ آپ کے خیال مں کتنے آدمی چھت پر رہے ہوں گے؟"

"کم از کم آٹھ آدمی تو ضرور چھت پر رہے ہوں گے، کیونکہ انہیں مسلسل چاروں طرف فائرنگ کرنا پڑ رہی ہے اور یہ کام آٹھ آدمیوں سے کم کر ہی نہیں سکتے۔ ان میں چار مارے جا چکے ہیں، گویا ابھی چار اور باقی ہیں۔"

"تو کیوں نہ ان پر ہیلی کاپٹر کے ذریعے فائرنگ کی جائے؟"

"وہ ہیلی کاپٹر کا نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح ہم ہیلی کاپٹر کا نقصان کر بیٹھیں گے۔"

"ہوں، گویا ہمیں صبر کرنا پڑے گا۔" بیگم جمشید بولیں۔

"میں تو یہی چاہتا ہوں کہ اوپر جا کر ان سے بھڑ جاؤں۔"

"آپ کے اوپر پہنچنے سے پہلے وہ سیڑھی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔" محمود بولا۔

"اچھا خیر، یونہی سہی۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

آدھ گھنٹے تک فائرنگ جاری رہی، پھر چھت پر خاموشی چھا گئی۔

"یہ ان کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے، ابھی ان کے پاس اور اسلحہ موجود ہو۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔ ساتھ ہی لاؤڈ سپیکر پر آواز ابھری۔

"تم لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دو اور نیچے اتر آؤ۔"

"ہم نیچے کس طرح اتر سکتے ہیں، سیڑھی گر چکی ہے۔"

"انسپکٹر جمشید اندر موجود ہیں۔ ان سے درخواست کرو، وہ سیڑھی لگا دیں

گے۔"

"میں سیڑھی لگانے کے لیے تیار ہوں، لیکن پہلے انہیں چاہیے کہ ہاتھ اوپر اٹھا کر عمارت کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو جائیں۔" ان سے انسپکٹر جمشید نے کہا۔ کھڑکیوں کے ذریعے ان کی آواز باہر تک پہنچ گئی۔

"ٹھیک ہے، تم لوگ منڈیر کے قریب آ جاؤ۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" ڈی ایس پی کی آواز ابھری۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولے:

"ٹھیک ہے، انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے ہیں اور منڈیر کے قریب آ گئے ہیں، آپ سیڑھی لگا دیں۔"

"ہوشیار محمود، ان کی طرف سے کوئی چال بھی چلی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ سوچ سکتے ہیں، اب انہیں مرنا تو پڑے گا ہی، کیوں نہ دو چار کو مار کر مریں، لہٰذا تم دروازے میں رہ کر، تھوڑا سا کھولے رکھ کر نگرانی کرو گے۔ میں اب باہر جا کر سیڑھی اوپر لگاتا ہوں۔"

"جی بہتر۔" محمود نے کہا اور ان کے باہر نکلنے کے بعد دروازہ تھوڑا سا کھول لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تیار تھا اور وہ اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید سیڑھی کے قریب گئے اور سیڑھی اٹھانے کے لیے جھکے ہی تھے کہ کسی نے ان کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ دھڑام سے گرے اور پستول ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ محمود کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے اس آدمی کو اٹھتے دیکھا، جس کے سینے میں اس نے چاقو اتارا تھا۔ اس کا مطلب ہے، چاقو اس کے دل میں نہیں لگا تھا اور وہ ابھی تک زندہ تھا۔ فوراً ہی وہ اس کے والد پر جا پڑا۔ ادھر انسپکٹر جمشید بھی زخمی تھے، لیکن اس کی نسبت کم، انہوں نے آن کی آن میں اسے اچھال پھینکا اور وہ دروازے کے قریب گرا۔ محمود نے ہاتھ باہر نکالتے ہی پستول کا دستہ اس کے سر پر رسید کر دیا اور وہ بے حس

و حرکت ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید اٹھے اور سیڑھی دیوار سے لگا دی، پھر فوراً اندر آ گئے۔

"محمود دروازہ بند کر لو۔" انہوں نے کہا، پھر کھڑکی کی طرف منہ کر کے بولے:

"ڈی ایس پی صاحب، اب آپ لوگ اوپر آ جائیں، تاکہ ان لوگوں کو گرفتار کر سکیں۔"

پندرہ منٹ بعد سب لوگ گرفتار کیے جا چکے تھے۔ وہ ان لوگوں کو لے کر نیچے آ گئے اور جیپوں میں بٹھا دیا۔ یہ پانچ تھے۔ ان کے علاوہ ایک شدید زخمی تھا۔ دو جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ ایک فرار ہو گیا تھا، گویا کل آٹھ آدمی اس عمارت میں قابض تھے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کی نظر ٹیکسی ڈرائیور پر پڑی اور حیران رہ گئے۔ وہ سڑک کے کنارے اب تک اسی جگہ موجود تھا، جہاں وہ ٹیکسی سے اترے تھے۔ وہ اس کے نزدیک پہنچے اور بولے:

"کیوں بھئی، خیر تو ہے۔ آپ ابھی تک یہاں موجود ہیں۔"

"آپ ہی نے تو ٹھہرنے کے لیے کہا تھا سر۔" اس نے معصومانہ لہجے میں کہا اور انسپکٹر جمشید کو یاد آ گیا، جب انہوں نے اسے ٹھہرنے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت پولیس وہاں نہیں پہنچی تھی، ضرورت کے پیشِ نظر انہوں نے اسے ٹھہرے رہنے کے لیے کہہ دیا تھا، لیکن پولیس کی جیپوں کے آ جانے کے بعد اس کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور وہ اس سے کہنا بھول گئے تھے، بلکہ ابھی تو انہوں نے اس کا بل بھی ادا نہیں کیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، میں آپ سے کہنا بھول گیا۔ خیر آپ کا اس وقت تک کا بل کتنا بنا ہے۔"

"جی ایک سو بیس روپے دے دیں۔" وہ بولا۔

انسپکٹر جمشید نے اسے دو سو روپے دیتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے، آپ یہ دو سو روپے ہی رکھیں۔ آپ کو زحمت ہوئی ہے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

انسپکٹر جمشید وہاں سے ہٹ کر پولیس کے پاس آئے۔

"ڈی ایس پی صاحب، آپ ان لوگوں اور لاشوں کو لے چلیے، زخمی کو بھی ہسپتال میں داخل کرانا ہے۔ دیر کرنا انسانیت کے خلاف ہوگا۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ کے لیے ایک جیپ چھوڑے جاتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

اور جیپوں کا قافلہ روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کیطرف مڑے ہی تھے کہ پھر ٹیکسی پر نظر پڑی۔ ٹیکسی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اب تو انسپکٹر جمشید کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ ایک بار پھر ٹیکسی کی طرف آئے۔ اس بار محمود بھی ان کے ساتھ تھا۔

"کیوں بھئی، اب کیا ہے؟"

"میں اس لیے رک گیا تھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو شہر جانے کے لیے ٹیکسی کی ضرورت پڑ جائے۔"

نہیں بھئی، اب ہمارے پاس جیپ موجود ہے۔"

"جی بہتر، تب تو میں چلتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے اور ٹیکسی چلا دی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"اف خدا، معرکہ کس قدر خوف ناک تھا۔" محمود بول اٹھا۔

"نہ صرف خوف ناک، بلکہ سنسنی خیز بھی۔ وہ لوگ نہ جانے کہاں ہوں گے۔ اصل مجرم تک پہنچ بھی سکے ہوں گے یا نہیں۔"

"اصل مجرم، تو کیا آپ کے خیال کے مطابق اصل مجرم وہ تھا، جو میرے ہاتھ سے نوٹ بک لینا چاہتا تھا۔"

"ہاں، کیونکہ اس کے بعد اس کی آواز سنائی نہیں دی۔" انہوں نے کہا۔

"خیر، انکل خان رحمان، فاروق اور فرزانہ اسے جانے نہیں دیں گے۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم یہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ ہمیں بھی خون کی بوندوں کو دیکھتے ہوئے اس طرف جانا چاہیے۔ ہمیں یہ کسی لمحے بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے۔ منصوبہ بنانے والے نے ہر پہلو کو نظر میں رکھا ہوگا۔ شکست ہو جانے کی صورت میں فرار کا انتظام بھی کیا گیا ہوگا۔"

"اوہ، آپ تو مجھے ڈرائے دے رہے ہیں۔" محمود بولا۔

"آؤ چلیں۔ ڈرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم کچھ کر گزریں۔" وہ بولے۔

"اور ہم لوگ کیا کریں؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"آپ لوگوں کے لیے بہترین پناہ گاہ اس مکان کا اندرونی کمرہ ہے۔ اس میں بند ہو کر بیٹھ جائیے۔ اگرچہ اب کسی خطرے کا امکان نہیں، لیکن پھر بھی ہمیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"بہت بہتر۔" انہوں نے کہا اور سب کو لے کر مکان کی طرف چل پڑے۔ جب وہ اوپر جا چکے اور انہوں نے اندرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی تو وہ بھی محمود کو ساتھ لیے مکان کے پچھلی طرف سے جنگل میں داخل ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید نے جیب سے ٹارچ نکال لی اور خون کے دھبے تلاش کرنے لگے۔ دھبے انہیں جلد ہی نظر آ گئے اور وہ ان پر نظر رکھ کر قدم اٹھانے لگے۔

"ویسے ابا جان، بہتر تو یہ تھا کہ ہم کچھ پولیس والے یہاں بھی رکھ لیتے۔" محمود بولا۔

"ہاں، بس غلطی ہوگئی۔" انہوں نے کہا۔

"اب کیا خبر، دشمنوں کے کچھ ساتھی ادھر ادھر بھی چھپے ہوئے ہوں اور موقع مناسب جان کر پھر مکان پر قبضہ کرلیں اور پہلے جیسی صورت بن جائے۔"

"اللہ رحم کرے، اب تم مجھے ڈرائے دے رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید گھبرا کر بولے اور محمود مسکرایا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔ بند کمرے میں وہ محفوظ ہیں اور اب مجرم پہلے والا جھانسہ نہیں دے سکتا۔ کتنا دھوکا دیا انہوں نے۔ ہم تمام وقت یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے ساتھیوں کی کن پٹیوں سے پستول لگے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، یہ ان کی زبردست چال تھی اور عملی طور پر اسے پورا کرنے کے لیے انہیں چار اور ساتھیوں کی ضرورت ہوتی، لیکن انہوں نے چار آدمیوں کی بجائے جھوٹ سے کام نکالا۔"

اب وہ گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ خون کے قطرے ان کی راہنمائی کر رہے تھے۔ اچانک ان کے کان کھڑے ہوگئے۔

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

☆☆

وہ جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن پھر خان رحمان چلا اٹھے:

"کیا کر رہے ہو، وہ مسلح ہوگا۔"

ان کی آواز انہیں ہوش وحواس کی دنیا میں لے آئی۔ اب وہ درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھنے لگے۔ پنسل ٹارچ بجھا دی گئی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹیں ابھی تک روشن تھیں اور وہ آسانی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آخر اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا، جیپ خالی تھی۔ اس میں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے جیپ کی

چاروں طرف دیکھا، لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ آخر وہ جیپ میں داخل ہوگئے اور نوٹ بک تلاش کرنے لگے۔ دفعتہً خان رحمان کے منہ سے نکلا:

"خبردار، میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔"

"یا اللہ رحم، پھر خطرہ آ کودا۔ لیکن انکل، مجھے تو دُور دُور تک خطرہ نظر نہیں آ رہا۔" فاروق بولا۔

"تم عقل سے پیدل ہونا، نظر آئے بھی کیسے۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"تم تو اس طرح کہہ رہی ہو، جیسے اپنے تیز ترین کانوں سے خطرے کو دیکھ رہی ہو۔"

اس کے جملے پر خان رحمان کو ہنسی آ گئی، پھر وہ دبی آواز میں بولے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کچھ لوگ ہمیں گھیرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہمیں جلد از جلد اپنے بچاؤ کی کوشش کر لینی چاہیے۔ میرا خیال تو بلکہ یہ ہے کہ ہم گھر چکے ہیں۔" اس مرتبہ ان کی آواز سے فکر جھانک رہا تھا۔

"پھر، انکل، اب ہم کیا کریں؟" فرزانہ بولی۔

"درختوں پر کیوں نہ چڑھ جائیں۔" فاروق بولا۔

"رات کے وقت درختوں پر چڑھنا بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا۔ کسی سانپ وانپ سے بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔" خان رحمان نے انکار میں سر ہلایا، لیکن پھر بولے:

'فاروق کی تجویز پر ہی عمل کرنا پڑے گا۔ سنو، میں جیپ کی لائٹیں بجھا رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم آس پاس کے تین درختوں پر چڑھ جائیں گے۔ دُور نہیں جانا ہے اور اوپر رہ کر حالات کا جائزہ لیں گے۔ جب تک بہت ضروری نہ ہو فائر نہ کرنا، بلکہ میرے فائر کا انتظار کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں انکل، اس ننھی سی فوج کی کمان آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔" فاروق نے کہا اور خان رحمان نے لائٹیں بجھادی۔ اب گھپ اندھیرا ہوگیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی درخت چن لیے تھے، لہٰذا اندھیرے میں ان پر چڑھنے لگے، حالانکہ یہ ایک بہت خطرناک کام تھا، لیکن اس کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ اچانک ایک آواز اُبھری:

"فائر۔"

اور تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں۔ ان کا بروقت لائٹیں بجھانا کام آ گیا تھا۔

اب وہ بلا کی تیزی سے درختوں پر چڑھ رہے تھے۔ کئی گولیاں ان کے آس پاس سے گزر گئیں اور وہ کانپ اٹھے۔ ایسے میں گولیوں سے بچنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی۔ درختوں پر چڑھنے میں فاروق کو مہارت تھی، اس لیے درخت پر چڑھنے میں اس کا پلّہ بھاری رہا۔ وہ فرزانہ اور خان رحمان سے بہت پہلے اوپر پہنچ گیا اور اندھوں کی طرح نیچے دیکھنے لگا۔ گولیوں کے شعلے جنگل میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ چاہتا تو ان شعلوں کی سیدھ میں فائر کر سکتا تھا اور کئی ایک کو لے بیٹھتا، لیکن خان رحمان کا اشارا ملے بغیر وہ ایسا نہ کر سکا اور انتظار کرنے لگا اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ اگر وہ فائرنگ شروع کر دیتا تو دشمن کی گولیوں کا رخ ان درختوں کی طرف ہو جاتا۔ خان رحمان اور فرزانہ زد میں آ سکتے تھے۔ اس وقت تک تو دشمن صرف اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ آخر اس نے محسوس کر لیا کہ خان رحمان اور فرزانہ بھی اپنے اپنے درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اس نے ایک درخت کی طرف سے بھی فائر ہوتے سُنا ساتھ ہی خان رحمان کی سرگوشی سنائی دی:

"بہت محتاط رہ کر فائر کرو، اس طرح کہ ایک بھی گولی ضائع نہ جائے۔"

اور وہ فائرنگ کرنے لگے۔ پہلی چیخ خان رحمان کی ایک گولی کے جواب میں سنائی دی۔ ایک [illegible] بعد فاروق کی ایک گولی کارگر رہی۔ فرزانہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے ایک سیدھ میں تین گولیاں جھونک ماریں اور ایک چیخ اس نے بھی سُن لی، گویا وہ تین آدمیوں کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"اوہ، کم بختو، یہ کیا کر رہے ہو۔ ٹارچوں کی مدد سے انہیں دیکھو اور دیکھ کر فائر کرو۔" جنگل میں ایک آواز ابھری، لیکن یہ وہ آواز نہیں تھی جو مکان سے انہیں سنائی دیتی رہی تھی۔

"لل۔ لیکن جناب، ٹارچیں...."

"شٹ اپ۔" غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

جوں ہی ٹارچیں روشن ہوئی۔ انہوں نے ایک ایک گولی ان پر چلادی۔ تین ٹارچیں فوراً بجھ گئیں۔ باقی شاید خود بجھادی گئیں۔

"ٹھیک ہے، ٹارچیں رہنے دو۔ اندھا دھند گولیاں برساؤ۔"

"لیکن جناب، اس کی ضرورت کیا ہے۔ نوٹ بک باس کے قبضے میں آ چکی ہے۔ اب ہمیں ان لوگوں سے بھڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"باس کا حکم، انہیں فرار ہونے کے لیے مہلت کی ضرورت تھی اور وہ مہلت انہیں دینے کے لیے ہی ہم یہاں مقرر کیے گئے تھے۔ اب تک وہ بہت دور جا چکے ہوں گے اگر یہ لوگ ہمارے گھیرے میں نہ آ جاتے تو باس تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ وہ پہلے ہی زخمی ہو چکے ہیں۔ اتنی تیز رفتاری سے نہ بھاگ سکتے، عقل کے اندھو، ان لوگوں سے بھڑنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب، ان حالات میں تو واقعی ضرورت ہے۔"

"لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں، بس دس منٹ اور، پھر باس ان کے ہاتھ

نہیں لگ سکے گا۔"

یہ گفتگو انہوں نے صاف سنی اور وہ سمجھ گئے کہ واقعی وہ باس کا تعاقب کرنے کے قابل نہیں رہے۔ مجبوری تھی۔ درختوں پر ہی جمے رہے اور جواب میں اکا دکا فائر کرتے رہے۔ اچانک الو کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ تینوں کے کان کھڑے ہو گئے، پھر فاروق نے منہ سے الو کی آواز نکالی۔ لیکن یہ آواز بہت بھونڈی نکلی، کیونکہ عام طور پر یہ فرض محمود انجام دیا کرتا تھا، تاہم گزارا ہو گیا اور انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری:

"ہم آ گئے ہیں فاروق فکر نہ کرنا۔ پولیس کی پوری جمعیت تھوڑی دیر تک پورے جنگل کو گھیرے میں لے لے گی۔ تم لوگ جہاں ہو وہیں جمے رہو۔" جواب میں وہ کچھ نہ بولے۔ بولنا خطرناک ثابت ہوتا۔

ان کے الفاظ نے دشمنوں پر دہشت طاری کر دی۔ یوں بھی وہ دس منٹ بعد کھسک جانے والے تھے۔ اب انہیں وقت سے کچھ پہلے ہی کھسک جانا پڑ گیا۔ چند منٹ تک جب ان کی طرف سے کوئی فائر نہ کیا گیا تو فاروق نے سرگوشی کی:

"میرا خیال ہے، دشمن کھسک لیے ہیں۔"

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" خان رحمان بولے

"لیکن معلوم کیسے ہو؟" فرزانہ بولی۔

"ہمیں کچھ دیر اور صبر سے کام لینا پڑے گا۔"

چنانچہ دس منٹ تک صبر سے کام لیا گیا۔ پھر فاروق نے کہا:

"ابا جان، ہمارا خیال ہے، دشمن فرار ہو چکا ہے آپ لوگ ذرا احتیاط رہ کر ٹارچ روش کریں، تا کہ معلوم ہو سکے، آپ کہاں ہیں۔"

ان کی طرف سے فوراً ٹارچ روشن کی گئی۔ کسی سمت سے کوئی فائر نہ ہوا۔

اب فاروق نے اپنی جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر روشن کی۔ اس طرح دونوں پارٹیوں کو ایک دوسرے کی سمت کا اندازہ ہو گیا۔

جلد ہی وہ ایک دوسرے کے پاس کھڑے تھے ایک دوسرے کے حالات سُنے گئے۔

"تو تم نوٹ بک حاصل نہیں کر سکے۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں مایوسی کی جھلک تھی۔

☆☆☆

شکست کے بعد

"جی ہاں ابا جان، مجھے بہت افسوس ہے۔ سیڑھی کھینچنے کی گھبراہٹ میں نوٹ بک کا خیال ذہن سے نکل گیا۔" محمود بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں، یہ بھی ایک بہت بڑی کامیابی ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کو بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آؤ اب چلیں۔"

سب واپس پہاڑی مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر کوئی سوچ میں گم تھا۔

"اس کا مطلب ہے، ہم یہ کبھی نہیں جان سکیں گے کہ ان لوگوں کا سرغنہ کون تھا، جو یہ خوفناک منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ اور نہ ہی یہ جان سکیں گے کہ اس نوٹ بک میں کیا تھا۔" فرزانہ نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، اور یہ سب کچھ محمود کی وجہ سے ہوا۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"نہیں بھئی، اس میں محمود کا کوئی قصور نہیں۔ اس سے جو ہو سکا کر گزرا۔ ان حالات میں اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا، بہر حال ہم اسے اپنی ناکام مہم ہی کہیں گے۔ حالات اور واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو تو یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے کالمباوادی میں بہت پہلے سے تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے پہلے تو اس آسیب زدہ مکان کو منتخب کیا۔ کیونکہ یہ آبادی سے ہٹ کر ہے اور آسیب زدہ ہونے کی وجہ سے لوگ اس سے دُور

دُور ہی رہتے ہیں، لہٰذا یہ مکان ان کے منصوبے کے لیے بہت کارآمد تھا۔ اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے، پھر وادی کے لوگوں کا جائزہ لیا گیا اور انہیں ایک ایسا آدمی مل گیا جو جگہ جگہ یہ کہتا پھرتا ہے کہ انسپکٹر جمشید اس کا دوست ہے۔ بس سرغنہ نے اس کے نام سے خطوط لکھے اور بھیج دیے۔ صرف ایک خط اس لیے نہیں بھیجا کہ کہیں میں اس کی طرف توجہ نہ دوں۔ اس نے پراسرار طریقہ اختیار کیا اور الگ الگ خطوط بھیج کر یہ ظاہر کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ کو جاننے کے لیے ہم کالمباوادی ضرور پہنچتے اور یہی وہ چاہتا تھا کہ ہم سب یہاں پہنچ جائیں۔ اس کے بعد وہ عامرہ کو اغوا کرے۔ عامرہ کو اغوا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ ہم اپنے کسی فرد کے اغوا ہونے کو خاطر میں نہ لاتے اور ان کا مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیتے، چنانچہ عامرہ کو لایا گیا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اپنی بیگمات اور ملازم کو بھی بلا لیں گے، بہر حال انہوں نے سوچا، ایک کو یرغمال بنانے سے یہ بہتر ہے کہ چار کو بنا لیا جائے، لیکن وہ اتنا عملہ ساتھ نہیں لائے تھے کہ چار آدمیوں کی کن پٹیوں پر پستول رکھ کر کھڑے رہیں۔ یعنی کسی اور کام کے نہ رہ جائیں۔ باقی چھت پر مقرر رہیں۔ صرف سرغنہ عمارت کے اندر گفتگو کے لیے رہے، چنانچہ انہوں نے جھوٹ کا سہارا لیا اور ہمارے ساتھیوں کو باندھ کر اندرونی کمرے میں ڈال دیا اور ہمیں یہ بتاتے رہے کہ ایک ایک کی کن پٹی پر ایک ایک پستول رکھا ہے، ہم دم بخود نہ ہو جاتے تو کیا کرتے، لہٰذا ان کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئے اور نوٹ بک کو دارالحکومت سے منگایا گیا۔ اس سے پہلے اس نوٹ بک کو اتنی اہمیت دی ہی نہیں گئی تھی، ورنہ شاید اس کا راز بھی معلوم کر ہی لیا جاتا، بہر حال اس سارے واقعے میں جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی، وہ صرف یہ ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور ہمارا سامان کیوں لے اڑے۔ اور......" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"اور کیا ابا جان۔ اور کے بعد بھی تو کچھ کہیے۔" فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

"پہلے تم ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں کوئی خیال ظاہر کرو۔ اس کے بعد میں اور کے بعد کچھ کہوں گا۔" وہ مسکرائے۔

"پولیس افسر کا کہنا ہے کہ وہ اس وادی کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے تنگ آ گئے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس علاقے کے ٹیکسی ڈرائیور پہلے بھی اس قسم کی وارداتیں کرتے رہے ہیں اور یہ پہلا واقعہ نہیں ہے تو اس میں عجیب بات کیا ہو سکتی ہے؟" محمود جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"ہوں، بات تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے، اس وادی کے ٹیکسی ڈرائیور سیر کی غرض سے آنے والے لوگوں کو کبھی کبھار لوٹ لیتے ہیں، لیکن تین ٹیکسی ڈرائیوروں کا ایک ساتھ واردات کرنا عجیب سی بات ہے۔ کیا یہاں اچکے ٹیکسی ڈرائیوروں کا پورا گروہ موجود ہے۔"

"ہو سکتا ہے، یہی بات ہو۔"

"تب ہمیں ان کا پتا چلانا ہوگا، کیونکہ لوگ آئے دن ان کا شکار ہوتے رہتے ہوں گے۔" وہ بولے۔

"ہاں، یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ نوٹ بک والے معاملے میں شکست کھانے کے بعد کچھ نہ کچھ کام تو دکھانا ہی چاہیے، ورنہ دارالحکومت والے کیا کہیں گے۔" فاروق بولا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی ہمیں کیا کہتا ہے۔" انسپکٹر جمشید منہ بنا کر بولے۔

اب پہاڑی مکان انہیں نظر آنے لگا تھا۔

"ابا جان، ہم ایک بات بھول رہے ہیں۔" اچانک فرزانہ نے چونکی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔" فاروق بول اٹھا۔

"ہم نے مکان کی چھت پر ٹیپ ریکارڈر دیکھا تھا۔ دونوں کمروں میں سپیکر بھی فٹ ہیں۔ کوئی شخص آسیب کا چکر چلاتا رہا ہے، نہ جانے کس لیے، یہ بات حلق سے نہیں اترتی کہ صرف رہائش رکھنے کے لیے۔ اس سے بھلا کیا فائدہ۔ تو کیا کوئی شخص کسی اور وجہ سے مکان کو آسیب زدہ مشہور کیے ہوئے ہے اور مسلسل ایسی کوشش کرتا رہتا ہے، تاکہ بھول کر بھی یہ خیال نہ کر پائیں کہ مکان اب آسیب زدہ نہیں رہا، آخر کیوں؟ دوسرے یہ کہ وہ آج رات کہاں رہا۔ آج کیوں پروگرام کے مطابق نہیں آیا۔ کیا نوٹ بک والے مجرموں نے اس سے کوئی معاہدہ کیا تھا کہ ایک دن کے لیے مکان انہیں دے دیا جائے۔ ضرور ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے ابا جان؟"

"ویری گڈ فرزانہ، تم نے ایک بہت ہی بہترین نقطہ اٹھایا ہے اور یہ بات شروع سے ہی میرے ذہن میں چبھ رہی تھی اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس کا جواب بھی میرے پاس موجود ہے۔" انہوں نے پراسرار انداز میں کہا۔

"جی، کیا فرمایا، اس بات کا جواب آپ کے پاس ہے؟" محمود حیرت زدہ انداز میں بولا۔

"ہاں بالکل، کیونکہ میں شروع سے ہی اس پہلو پر غور کرتا رہا ہوں۔ اس مکان کو واقعی چند اشخاص آسیب زدہ ظاہر کر کے اسے استعمال کرتے رہے ہیں اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ انہوں نے نوٹ بک والے مجرموں کو ایک دن کے لیے مکان استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے آپس میں کوئی

معاملہ طے کرلیا ہوگا۔"

"آپ کسی جواب کی بات کر رہے تھے، جو آپ کے پاس ہے۔" فاروق نے بغور ان کی طرف دیکھا

"اور میرا جواب یہ ہے کہ اس مکان کو وہ اُچکے ٹیکسی ڈرائیور ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔" وہ بولے۔

"جی، کیا مطلب؟"

وہ بھونچکے رہ گئے۔ منہ کھلے کے کھلے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆

پہاڑی مکان میں حالات معمول پر تھے۔ ان کے بعد کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا تھا، لہٰذا انہوں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

"میں چند ضروری کام نبٹانے کے لیے آبادی میں جاؤں گا۔ ایک آدھ گھنٹے تک لوٹ آؤں گا، تم لوگ آرام کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے

"تو آپ ہمیں بھی کیوں نہ ساتھ لے چلیں۔" محمود بولا۔

"نہیں بھئی، میرا تنہا جانا ہی مناسب ہوگا۔" انہوں نے کہا اور دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ انہیں سیڑھیاں اترتے دیکھتے رہے، پھر انہیں سڑک کی طرف جاتے دکھائی دیتے رہے۔

"اب تو انہیں پیدل ہی جانا پڑے گا۔ رات کے وقت ادھر کوئی ٹیکسی ڈرائیور کہاں ملے گا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے انہیں کوئی خاص بات سوجھ گئی ہے۔" فاروق نے کہا۔

"بھئی، ہم سونے لگے ہیں۔ تم لوگ اپنے خیالات ایک دوسرے کو

سناتے رہو، لیکن سونے سے پہلے دروازے اندر سے بند کرنا نہ بھولنا۔ کیا خبر، وہ آسیب والے مجرم آجائیں اور ہمیں پھر ہاتھ پیر ہلانے پڑیں۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"تو کیا ہوا انکل، ہاتھ پیر ہلانا تو بہت اچھا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اگر یہ بات ہے تو تم تمام رات ہاتھ پیر ہلاتے رہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" خان رحمان بولے اور وہ مسکرانے لگے، پھر انہوں نے اٹھ کر دروازے بند کرلیے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے ایک بجے کے قریب دستک ہوئی۔ فرزانہ کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی۔ نیند کے عالم میں وہ اٹھی اور اندرونی دروازہ کھولنے کے بعد بیرونی دروازے پر پہنچی۔

"کون ہے؟"

"کھولو فرزانہ، میں ہوں۔" باہر سے انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر جمشید کا چہرہ جوش کے عالم میں تمتما رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ بولے:

"فرزانہ، ابھی ہم نہیں ہارے۔ سب لوگ فوراً میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوجائیں۔"

"کہاں جانا ہے اباجان؟" اس نے حیران ہوکر کہا۔

"یہ سوال اور جواب کا وقت نہیں، جلدی باہر نکلو۔"

فرزانہ واپس مڑی تو محمود اور فاروق اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ انہوں نے یہ گفتگو سن لی تھی، البتہ باقی لوگ ابھی تک سوئے پڑے تھے، انہیں بھی جگایا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ باہر نکل رہے تھے اور پھر سڑک پر ایک سمت میں چلے جا رہے تھے۔ ان کا رخ آبادی کی طرف تھا، لیکن آبادی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ ایک

طرف مڑ گئے اور ایک پرانے سے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

"ہمیں اس مکان کے اندر داخل ہونا ہے۔" انہوں نے سرگوشی کی۔

"لیکن کس خوشی میں ابا جان؟"

"ہر بات میں خوشی کے پیچھے نہ پڑ جایا کرو۔" فرزانہ بھنا اٹھی۔

"ہم کس طرح داخل ہوں گے ابا جان، کیا دروازہ اندر سے بند ہے؟"

"ہاں، لیکن تم فکر نہ کرو، فاروق یہ کام انجام دے گا۔" وہ مسکرائے۔

"جی کون سا کام؟"

"اندر داخل ہونے والا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں، تم کس طرف سے داخل ہونے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

وہ مکان کے پچھلی طرف آئے۔ یہاں ایک درخت موجود تھا اور اس کی شاخیں مکان کی چھت تک جا رہی تھیں۔

"میرے مقدر میں تو بس درختوں پر چڑھنا ہی رہ گیا ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔ اور درخت پر چڑھنے لگا۔ وہ اس کام میں اس قدر ماہر تھا کہ جوتے بھی نہیں اتارتا تھا اور اب تو اس کی دیکھا دیکھی محمود اور فرزانہ نے بھی جوتے اتارنا چھوڑ دیے تھے۔

"ہم دروازے کے ذریعے اندر داخل ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے ہدایت دی۔

"تو پھر آپ دروازے پر پہنچے۔ میں ابھی کھولتا ہوں۔"

وہ پھر چکر کاٹ کر دروازے کی طرف آ گئے۔ دو منٹ بعد دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھلا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ نچلی منزل میں ایک کمرے کے روشندانوں سے انہیں روشنی جھانکتی نظر آئی۔ وہ دبے پاؤں اس طرف بڑھے۔ کمرے کا دروازہ

پوری طرح بند نہیں تھا۔ انہوں نے سنا، کوئی کہہ رہا تھا:

"ایک طرح سے ہم ناکام نہیں رہے۔ نوٹ بک حاصل کر کے ہم اپنے ملک بھیج چکے ہیں۔ انسپکٹر جمشید اس وقت اس خیال میں ہوگا کہ ہم ملک کی سرحد پار کر کے فرار ہو چکے ہیں، لیکن ہم یہاں موجود ہیں۔" یہ وہی آواز تھی جو مکان کے اندر سے انہیں سنائی دیتی رہی تھی۔

"لل، لیکن جناب، اب آپ لوگوں کا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ مجھے وہ شخص بہت چالاک نظر آتا ہے۔ اس کی نظریں مجھے اپنے جسم کے اندر اترتی محسوس ہوئی تھیں۔"

"تم فکر نہ کرو، ہم ابھی روانہ ہو جاتے ہیں۔ تمہارا مکان ہم نے اپنے ساتھیوں کے جمع ہونے کے لیے منتخب کیا تھا۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔ تم نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ اب تم اپنا کام بدستور جاری رکھ سکو گے۔"

"کیا خاک جاری رکھ سکیں گے۔ وہ سر پھرے تو پہاڑی مکان میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔"

"لیکن کتنے دن، زیادہ سے زیادہ وہ ایک ہفتے تک رہ لیں گے۔ اس کے بعد تم اپنا کام پھر شروع کر دینا۔"

"خیر آپ کے سب ساتھی آ چکے ہیں۔ آپ ہمارا معاوضہ ہمیں دیں۔ اور یہاں سے رخصت ہو جائیں، کہیں ہم دشمن ملک کے ایجنٹوں کا ساتھ دینے کے الزام میں دھر نہ لیے جائیں۔"

"فکر نہ کریں، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ یہاں جمع ہیں۔"

"تمہارا خیال غلط ہے مسٹر، یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ تم یہاں جمع

ہو۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے دروازے کو ایک ٹھوکر رسید کی اور اندر داخل ہو گئے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ ان کے پیچھے باقی سب لوگ بھی اندر داخل ہو گئے۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان کے ہاتھوں میں بھی پستول چمک رہے تھے۔

اندر موجود لوگ دھک سے رہ گئے۔ ادھر محمود، فاروق، فرزانہ باقی سب لوگ اندر موجود لوگوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اگر حیرت نہیں تھی تو صرف انسپکٹر جمشید کے چہرے پر۔

☆☆☆

شاندار ناکامی

کمرے میں وہ تینوں ٹیکسی ڈرائیور موجود تھے، جو ان کا سامان لے اڑے تھے۔ ان کے علاوہ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی موجود تھا، جس کی ٹیکسی میں انسپکٹر جمشید پہاڑی مکان تک آئے تھے اور پھر اسے انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ غیر ملکی دشمنوں کے خلاف جھڑپ کے دوران بھی سڑک پر ہی رکا رہا تھا۔ ان چاروں کے علاوہ نو آدمی اور تھے۔ ان میں سے ایک سب سے لمبا اور نمایاں چہرے مہرے کا آدمی تھا۔ اس کی شکل صورت سے ہی یہ بات ٹپک رہی تھی کہ وہ ان سب کا سرغنہ ہے۔

"تو وہ تم ہو جو منصوبہ بنا کر آئے تھے؟"

"ہاں۔" اس نے کینہ توز نظریں انسپکٹر جمشید پر گاڑ دیں۔

"لیکن تمہارے منصوبے کی تفصیلات تو ختم ہو چکی ہیں۔ یہ سین تو منصوبے سے الگ ہے، اب تم کیا کرو گے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تم مجھے نہیں جانتے، میں ان پستولوں کو خاطر میں لانے والا آدمی نہیں۔ ابھی دیکھ ہی لو گے۔"

"ہو سکتا ہے، تم نے بلٹ پروف لباس پہن رکھا ہو۔ خیر، تو نوٹ بک تم نے سرحد پار بھیج دی؟"

"ہاں، جنگل میں پہنچنے سے پہلے میں نے پہلا کام یہی کیا تھا، کیونکہ مجھے تو

ابھی اس مکان میں آنا تھا، تاکہ حساب کتاب کر دیا جائے۔" اس نے پُرغرور لہجے میں کہا۔

"حساب کتاب کیسا؟"

"ان سب کا۔ یہ یہیں رہتے ہیں۔ میرے لیے کام کرتے ہیں۔ انہیں ان کی خدمات کا صلہ تو دینا ہی تھا اور پھر ان ٹیکسی ڈرائیوروں کا حساب بھی چکانا تھا، جنہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔"

"اس نوٹ بک میں کیا تھا؟" محمود بولا۔

"یہ راز تم کبھی نہیں جان سکو گے۔" وہ بولا۔

"ہم تم سے اگلوا لیں گے، فکر نہ کرو۔ اب اپنا نام بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا کرو گے، سُن کر ڈر جاؤ گے۔" وہ ہنسا۔

"اوہو، بہت خوف ناک نام ہے تمہارا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"تب تو ذرا جلدی سے بتا دیں، کیونکہ بہت دنوں سے ہوش اڑ جانے کے لیے بے چین ہوں۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

تمہارے ہوش تو شاید نہ اڑیں۔ ہاں تمہارے والد محترم ضرور اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، کیونکہ تم نے میرا نام نہیں سنا ہوگا۔

"تمہارا نام قیامت تو نہیں؟" فاروق بولا۔

"یہ تو کوئی خوف ناک نام نہ ہوا۔ خیر سنو، مجھے لی کاف کہتے ہیں۔"

انسپکٹر جمشید گھبرا کر ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"لی کاف، یہ کیا نام ہوا؟"

"اپنے والد کے چہرے کی طرف دیکھو۔ معلوم ہو جائے گا، یہ کیا نام ہوا۔"

تینوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور خوف زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے والد کو اس حد تک خوف زدہ شاید ہی پہلے کبھی دیکھا ہوگا۔

"ابا جان، کیا آپ خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں؟"

"نن، نہیں۔" وہ ہکلائے۔

"خیر تو ہے، آخر یہ لی کاف صاحب ہیں کیا بلا؟"

"دنیا کا سب سے خوف ناک آدمی۔" وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولے۔

"لیکن شکل صورت سے تو یہ اتنا خوف ناک نہیں لگتا۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"تت، تم۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ لیکن نہیں۔ ہو سکتا ہے، یہ لی کاف نہ ہو، مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے صرف لی کاف کا نام استعمال کر رہا ہو۔ ہاں ٹھیک ہے، لی کاف بھلا یہاں کہاں اور پھر اس کا ہمارے ملک سے کیا تعلق، وہ تو ایک آزاد آدمی ہے، جس کا دنیا کے کسی بھی ملک سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں، وہ بڑی طاقتوں کے لیے کام ضرور کرتا ہے۔"

"اور اس مرتبہ تمہارے دشمن ملک نے مجھ سے یہ کام لیا ہے۔" وہ ہنسا۔

"لیکن میں کہتا ہوں، تم لی کاف نہیں ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جانتے بھی ہو لی کاف کی نشانی کیا ہے؟" اس نے بھنا کر کہا۔

"ہاں، اس کی زبان بالکل سیاہ رنگ کی ہے، جو مختلف قسم کے زہر استعمال کرنے کی وجہ سے سیاہ ہو گئی ہے۔ لی کاف اگر کسی جگہ تھوک دے تو اس جگہ سے

دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ کسی انسان کے جسم میں اپنے دانت تو کیا، انگلی کے ناخن سے خراش ڈال دے تو وہ انسان آناً فاناً مر جاتا ہے۔ لی کاف میں ایک مہلک ترین سانپ سے بھی زیادہ تیز زہر موجود ہے۔ لی کاف آدمی کو پانی بنا دیتا ہے۔"

"اگر یہ سب باتیں جانتے ہو تو لو دیکھو، لی کاف تھوک رہا ہے یقین کر لو کہ تمہارے سامنے اس وقت لی کاف موجود ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے فرش پر تھوک دیا۔ اس کا تھوک نیلے رنگ کا تھا۔ جلد ہی انہوں نے فرش پر سے دھواں اٹھتے دیکھا اور وہ لرز اٹھے۔ انسپکٹر جمشید بلا وجہ تو خوف زدہ نہیں ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید تو وہ شخص تھے، جنہوں نے خوف زدہ ہونا سیکھا ہی نہیں تھا، لیکن آج وہی انسپکٹر جمشید انہیں خوفزدہ نظر آرہے تھے۔

"اب کیا خیال ہے مسٹر جمشید؟"

"تم۔ تم ٹھیک کہتے ہیں۔ تم لی کاف ہی ہو۔"

"جانتے ہو، تمہارے دشمن ملک نے مجھے اس کام کا کتنا معاوضہ دیا ہے، چالیس کروڑ روپے صرف۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا، پھر ہنس کر بولا:

"اور اب میں اس میں سے ان لوگوں کو معاوضہ ادا کر رہا ہوں۔ تم یہ کارروائی نہایت خاموشی اور سکون سے دیکھتے رہو۔ میں نے تمہارا بہت نام سنا ہے۔ تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے مجھے۔ میں تم سے بلا وجہ نہیں الجھوں گا، لیکن اگر تم نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو پھر اپنے ساتھیوں کو زندہ نہیں لے جا پاؤ گے۔" اس کے ان الفاظ نے کمرے میں سنسنی پھیلا دی، پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور انہیں نوٹوں کی گڈیاں دینے لگا۔ نوٹ ڈالروں کی شکل میں تھے۔ جب اس کام سے فارغ ہو چکا تو بولا:

"بس، اب تم لوگ اس مکان سے رخصت ہو جاؤ۔ اب کبھی انسپکٹر جمشید کو

نظر نہ آنا، ورنہ یہ تمہیں گرفتار کر لیں گے۔ نظر نہ آنے کی صورت یہی ہے کہ کچھ عرصے کے لیے بالکل روپوش ہو جاؤ اور پھر کسی دوسرے شہر جا کر اپنا کاروبار شروع کر دو۔ انسپکٹر جمشید کو اپنی یہ ناکام مہم یاد رہنی چاہیے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے سوالیہ نظروں سے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ یہ دیکھ کر لی کاف بولا:

"انسپکٹر، تمہارے بچے پوچھنا چاہتے ہیں، کیا سب لوگوں کو فرار ہونے دیا جائے گا۔ تم انہیں بتا دو نا۔"

"ہاں بھئی ٹھیک ہے۔ اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔" انسپکٹر جمشید کی آواز کمرے میں گونجی۔

"بہت عقل مند ہو انسپکٹر۔ اب اپنے پستول جیب میں رکھ لو۔ کوئی گولی یا چاقو کا زخم مجھے زیادہ دیر پریشان نہیں رکھتا۔ میں چند منٹ میں ہی ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ ویسے تمہارے بیٹے کی تعریف کروں گا اس نے بہت پھرتی سے چاقو میرے سینے میں اتارا اور پھر نیچے کی طرف جھٹکا دیا۔ ویسے مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں وقتی طور پر بازی ہار گیا تھا۔ خیر یہ مہم میری زندگی کی بھی یادگار مہم ثابت ہوئی ہے۔ شاید ہم پھر بھی ملیں۔ میرے ساتھی رخصت ہو چکے ہیں، اب میں بھی جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، میرا راستہ روکنے کی بے وقوفانہ کوشش نہیں کرو گے۔ ہاں کچھ تیاری کر لو، تاکہ آئندہ کبھی ہمارا سامنا ہو تو دل کی بھڑاس نکال سکو۔ اس وقت میں خود تمہیں دل کے ارمان پورے کرنے کا موقع دوں گا۔ اس وقت مقابلے کے لیے اس لیے نہیں للکار رہا کہ تم آن کی آن میں شکست کھا جاؤ گے۔ اچھا بھئی، پھر ملاقات ہو گی۔"

اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ سب بُت بنے دیکھتے رہ گئے۔ تقریباً ایک منٹ بعد فاروق کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

''ابا جان، ابھی ابھی کیا ہم نے خواب دیکھا ہے؟''

''نن نہیں، بھئی، یہ خواب نہیں تھا۔''

''پھر آپ نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''اس لیے کہ عامرہ ہمارے ساتھ تھیں۔ حامد، سرور، ناز اور شائستہ بھی تھے۔ میں ان سب کی زندگیوں کو خطرے میں کس طرح ڈال دیتا، جب کہ نوٹ بک بھی لی کاف کے پاس نہیں تھی۔ اگر نوٹ بک اس کے پاس ہوتی تو پھر میں ضرور اس کا مقابلہ کرتا اگرچہ یہ مقابلہ ۹۹ فیصد موت کا مقابلہ ہوتا۔ لی کاف کا مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں۔''

ان کے الفاظ نے ان کے جسموں میں سنسنی کی لہر دوڑا دی اور انہوں نے محسوس کیا۔ انسپکٹر جمشید نے ٹھیک ہی کیا تھا جو لی کاف کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔

☆☆

دوسری صبح کالمباوادی کے تمام ٹیکسی ڈرائیور بلوا لیے گئے، لیکن ان میں وہ چاروں نہیں تھے۔ انہیں ہر طرف تلاش کرایا گیا، لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا اور نہ لی کاف کے ساتھیوں کا کوئی نشان ملا۔ ان کی تلاش جاری رکھنے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔ دوسری شام انسپکٹر جمشید بولے:

''اب میرا اس وادی میں دل نہیں لگ رہا۔ میں واپس جاؤں گا۔ اگر تم لوگ تفریح کے لیے رکنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''جی نہیں، اب ہم بھی یہاں رک کر کیا کریں گے۔'' محمود بولا۔

''خان رحمان اور پروفیسر صاحب، آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟''

''تمہارے بغیر تفریح کا کیا لطف؟'' خان رحمان بولے۔

''میں تو جانے کے لیے یوں بھی بہت بے چین ہوں۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''جی انکل، بے چین کیوں؟'' فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

''بھئی، کسی نہ کسی وجہ سے بے چینی ہو سکتی ہے۔'' پروفیسر صاحب بولے۔

''گویا آپ ہمیں بتانا نہیں چاہتے۔'' محمود نے بُرا مان کر کہا۔

''یوں سمجھ لو کہ میں نے ایک تجربہ شروع کر رکھا ہے۔ اسے پورا کرنا چاہتا ہوں۔''

''اگر یہ بات تھی تو پھر آپ کو ہمارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''یہ بھی ممکن نہیں تھا۔'' وہ مسکرائے۔

''چلیے، پھر واپس ہی چلے چلتے ہیں۔'' فاروق نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''بھئی، اگر تم یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو تو شوق سے ٹھہر جاؤ۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''میں اکیلا کیا کروں گا ٹھہر کر۔''

''اکیلے کیوں، محمود اور فرزانہ تمہارا ساتھ دیں گے۔''

''بالکل نہیں ابا جان، فاروق کا ساتھ دینے سے بہتر ہے، انسان لوہے کے چنے چبا لے۔'' فرزانہ بول اٹھی۔

''شہر پہنچتے ہی آرڈر دوں گا۔''

''کس چیز کا؟'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''لوہے کے چنے تیار کرنے کا، تا کہ، یہ چبا سکے۔'' فاروق بولا اور وہ مسکرانے لگے۔

آخر واپسی کی ٹھہری۔ اسی شام وہ دارالحکومت پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ سے باہر آتے ہوئے پروفیسر داؤد بولے:

"جمشید، میں چاہتا ہوں، سب لوگ میرے ساتھ تجربہ گاہ چلیں۔"

"جی وہ کس لیے؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"تا کہ وہاں اس شاندار ناکامی کا جشن منایا جا سکے۔" فاروق بولا۔

"شاندار ناکامی۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، جتنی شاندار ناکامی ہمیں اس کیس میں ہوئی ہے، اس سے پہلے کیا کسی کیس میں ہوئی ہو گی۔" وہ بولا۔

"بھئی، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنے ساتھیوں کو تو بچا لائے ہیں۔ عامرہ تو خیریت سے واپس آ گئی ہے نا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ایئر پورٹ پر آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب آئے ہوئے تھے۔ عامرہ دوڑ کر گئی اور اپنے ابا جان کے سینے سے لگ گئی۔ دونوں صاحبان اپنی لمبی کاروں میں آئے تھے۔ ان کے لیے جگہ بن گئی۔

"لیکن سر، ہمیں تو پروفیسر صاحب کہ تجربہ گاہ میں جانا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہاں کس لیے؟"

"پروفیسر صاحب کی خواہش یہی ہے۔"

"بلکہ آپ دونوں کو بھی چلنا پڑے گا۔" پروفیسر داؤد بول اٹھے۔

"اگر آپ کی خواہش یہی ہے تو ہم بھی چلے چلتے ہیں، لیکن عامرہ کی والدہ اس کے لیے بہت بے چین ہے۔"

"ٹھیک ہے، عامرہ بیٹی کو آپ گھر اتار دیں اور پھر تجربہ گاہ چلے چلیں۔"

"خیر تو ہے پروفیسر انکل آپ کچھ پراسرار نظر آ رہے ہیں۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"تم لوگوں کی صحبت کا اثر ہے۔" وہ مسکرائے۔

آخر وہ تجربہ گاہ پہنچے۔ پروفیسر صاحب نے تجربہ گاہ کے تمام دروازے بند کر لیے اور جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ اب ان کے سوا کوئی بھی ان کی بات نہیں بن سکے گا، تو وہ بولے:

"جمشید، ایک عدد سہرے کا بندوبست کر لو۔"

"جی سہرے کا بندوبست، کیا مطلب؟" وہ حیران ہو کر بولے

"بھئی سہرے کے بندوبست کا مطلب تو سہرے کا بندوبست ہی ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر کیس کا سہرا تم چاروں میں سے کسی ایک کے سر بندھتا ہے، لیکن اس بار ایسا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ مجرم بھی ہاتھ سے نکل گیا اور وہ نوٹ بک بھی جس کے لیے یہ سارا چکر چلا تھا اور اس لیے اس کیس کا سہرا نہیں بندھ سکا، لہٰذا میرا مطالبہ یہ ہے کہ اس کیس کا سہرا میرے سر رہنا چاہیے۔"

"ہاں، ٹھیک ہے انکل۔ آپ کو بھی اس کیس میں بہت کام کرنا پڑا ہے۔ ہیلی کاپٹر میں کالمباوادی سے دارالحکومت آنا پڑا۔ پھر نوٹ بک لے کر واپس گئے۔" محمود نے سر ہلایا۔

"یہ بات نہیں بھئی، دراصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سب کچھ ہار جانے کے باوجود ہم کچھ بھی نہیں ہارے۔"

"جی کچھ بھی نہیں ہارے۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کالمباوادی والا خط ملنے سے صرف چند منٹ پہلے میں اس نوٹ بک کی تحریر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ

تھوڑی دیر بعد ایک خط ملنے والا ہے اور مجھے تم لوگوں کے ساتھ کالسباوادی جانا پڑے گا اور وہاں اسی نوٹ بک کا معاملہ پیش آئے گا۔"

"اوہ، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" محمود پُرجوش انداز میں بولا۔ سبھی کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"وہاں جب اس نوٹ بک کا مطالبہ کیا گیا تو میں سکتے کے عالم میں رہ گیا، لیکن خاموش رہا، کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میں اس نوٹ بک کی تحریر دیکھ چکا ہوں۔"

"اف، تو جلد بتایئے نا، اس میں کیا لکھا تھا۔" انسپکٹر جمشید بے تاب ہو کر بولے۔

"افسوس، میں نہیں جانتا، اس میں کیا لکھا تھا۔"

"جی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے، تحریر پڑھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"میں نے یہ کہا تھا کہ تحریر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پہلا مسئلہ تو تحریر دیکھنے کا تھا، کیونکہ کسی ایسی روشنائی سے لکھا گیا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا، بہر حال میں نے کئی رنگ ملا کر ایک آئینہ پینٹ کیا تھا اور جب اس میں سے دیکھا تو الفاظ نظر آنے لگے تھے، لیکن وہ کسی عجیب وغریب زبان میں تھے۔ میں نے اسی وقت ان الفاظ کی تصویر اس آئینے کے ذریعے لے لی، لہٰذا نوٹ بک کی تحریر مرے پاس محفوظ ہے۔"

"وہ مارا۔" محمود چلا اٹھا۔

"پروفیسر انکل، اس کیس کا سہرا تو واقعی آپ کے سر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اب ضرورت ہے تحریر کے ایک ماہر کی، جو اسے پڑھ سکے۔" پروفیسر

صاحب بولے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے محکمہ میں تحریر پڑھنے کے کئی ماہر موجود ہیں۔ میں ان میں سے سب سے زیادہ قابل آدمی کو ابھی بلاتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر فون پر جھک گئے۔ تحریر کے ماہر کو ہدایات دینے کے بعد انہوں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر صاحب، آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔"

"نہیں بھئی، اس میں کمال کی تو بالکل بھی کوئی بات نہیں، بس یہ ایک اتفاق تھا۔" انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے بعد تین ماہرین پہنچ گئے۔ انہوں نے تحریر کی تصویر کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ کاغذ پر کچھ لکھتے بھی جا رہے تھے۔ آخر ایک گھنٹے بعد انہوں نے سر اوپر اٹھائے۔

"یہ دس آدمیوں کے نام اور حلیے ہیں۔ ان کی عمر اور شناختی علامات بھی درج ہیں۔ ان کے بارے میں سب سے اوپر یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہ دس بہترین ایجنٹ دشمن ملک میں جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔"

"اوہ۔ نہیں۔" انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔

"اس کا مطلب ہے، ہمارے دشمن ملک نے اپنے دس بہترین ایجنٹ جاسوسی کی غرض سے یہاں بھیج رکھے ہیں۔ ان دس کے نام حلیے اور عمریں وغیرہ اس نوٹ بک میں درج تھیں۔ تب وہ نوٹ بک ضرور دشمن ملک کی خفیہ سروس کے چیف کے پاس ہو گی اور کسی طرح ہمارے جاسوس کے ہاتھ لگ گئی ہو گی۔ دشمن نے نوٹ بک جب غائب پائی اور تحقیقات کی تو اسے معلوم ہو گیا کہ نوٹ بک ہمارے ملک میں پہنچ چکی ہے، بلکہ اس نے یہاں تک معلوم کر لیا کہ وہ کہاں موجود ہے۔ وہ چاہتے

تھے، اس سے پہلے کہ ہم نوٹ بک کی تحریر دیکھنے کے قابل ہوں، نوٹ بک کو واپس حاصل کر لیا جائے، چنانچہ انہوں نے یہ ذمے داری لی کاف کو سونپی، کیونکہ لی کاف کا کوئی منصوبہ آج تک ناکام نہیں ہوا۔ یقینی کامیابی کے لیے لی کاف کی خدمت حاصل کی گئیں اور اب وہ لوگ خوش ہو رہے ہوں گے کہ ہمارے مقابلے میں زبردست کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ لائیے، ذرا دیکھیں تو، وہ دس آدمی کون ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے تحریر کا غذ لیا جس پر انہوں نے تحریر کا مطلب لکھا۔

دس نام پڑھ کر وہ سناٹے میں آ گئے اور کاغذ آئی جی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ پڑھنے کے بعد ان کا اور ڈی آئی جی صاحب کا بھی بُرا حال ہو گیا۔

”اف خدا، یہ تو دس کے دس سرکاری عہدوں پر تعینات ہیں۔ اور وہ بھی بڑے بڑے عہدوں پر۔“

”جی ہاں، معلومات تو بڑے عہدوں داروں تک ہی پہنچتی ہیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اب کیا کیا جائے گا؟“ ڈی آئی جی بولے۔

”کرنا کیا ہے۔ ان لوگوں کی اسی وقت سے نگرانی شروع کرا دیتے ہیں۔ فوری طور پر گرفتار کرنے کی بجائے ہم اپنا گھیرا ان کے گرد تنگ کرتے چلے جائیں گے اور ایک دن گردن سے پکڑ لیں گے۔ ان کی ڈاک پہلے ہی خفیہ طور پر کھول کر پڑھ لیا کریں گے۔ ان کے فون ٹیپ کر دیے جائیں گے، انہیں ملنے والا پیغام ہم بھی سنا کریں گے اور سب سے بڑی اور مزے دار بات یہ کہ اب ان تک جو خاص اطلاعات پہنچا کریں گی، وہ غلط اطلاعات پہنچا کریں گی۔ اس طرح یہ دشمن ملک کو بھی وہ غلط اطلاعات پہنچایا کریں گے۔ دشمن اس غلط فہمی میں مبتلا رہے گا کہ ان کے لیے بہت کام کر رہے ہیں اور بہت قیمتی اطلاعات دے رہے ہیں لیکن درحقیقت ہو گا اس کے

الٹ اور اس طرح آخر کو بازی ہمارے ہاتھ رہے گی۔ لی کاف کا منصوبہ کامیاب ترین منصوبہ ہونے کے باوجود اور اس کے کامیابی سے بک حاصل کر لینے کے باوجود میدان ہمارے ہی ہاتھ رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں، یہ کچھ کم کامیابی نہیں ہے۔ ہم ہار کر بھی جیت میں رہے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

”میں بھی حیران تھا کہ اس بار ہم ناکام کس طرح ہو گئے۔ ناکامیاں تو ہمارے مقدر میں نظر ہی نہیں آتیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، میری حیرت غلط ثابت ہوئی۔“ فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

”حیرت غلط ثابت ہوئی، یہ کیا بات ہوئی؟“ خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

”ایک حیرت ہی کیا، اس کی تو ہر چیز اور ہر بات غلط ثابت ہوتی ہے۔“ فرزانہ نے جھنجلا کر کہا۔

”یہ سراسر الزام ہے اور میں اس الزام کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔“

”نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔“ محمود بولا۔

”یہ بڑی مصیبت ہے، میرے خلاف تم دونوں ایک ساتھ محاذ قائم کر لیتے ہو۔ اب میں بیک وقت دو دو محاذوں پر کس طرح لڑوں۔ خیر کوئی بات نہیں، میری زبان سلامت رہے۔ ترکی بہ ترکی جواب نہ دیے تو میرا نام فاروق نہیں۔“ اس نے شریر لہجے میں کہا۔

اور تجربہ گاہ میں موجود سبھی افراد بے ساختہ مسکرانے لگے۔

-----------☆☆☆-----------